اسلامی تحریک

قرآن و سنّت کی روشنی میں

حجۃ الاسلام شیخ محمد حسن صلاح الدّین

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

[illegible]

3082
Najafi Cassette Library
Books Sec.
Bait-ul-Sajjad
Soldier Bazar,
Karachi, Ph: 7222...4

اسلامی تحریک

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan,

قرآن و سنت کی روشنی میں

تالیف

حجۃ الاسلام شیخ محمد حسن صلاح الدین

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Welfare Trust (R)
Shop No. 11, M.L. Heights,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan,

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲-ج-۵/۴ ــــ ناظم آباد ــــ نمبر ۲ ــــ کراچی

نام کتاب ——— اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں

تالیف ——— حجتہ الاسلام شیخ محمد حسن صلاح الدین

ناشر ——— دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اول ——— ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ اکتوبر ۱۹۹۲ء

تعداد ——— ۲۰۰۰

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

3082-A

انتساب

ان داعیانِ اسلام، مبلغانِ دینِ الٰہی

اور

پاسبانانِ شریعتِ محمدیؐ کے نام

جو اسلامی تاریخ کے ہر دور میں متواتر اسلامی

اور اصلاحی تحاریک چلاتے رہے

اور

—— جنہوں نے بارگاہِ ایزدی میں نہایت خندہ پیشانی سے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور بالآخر سرخ روئی کے ساتھ خالقِ کریم و رحیم سے جا ملے۔

مؤلف

مدارک

۱ قرآن کریم

۲ نہج البلاغہ

۳ تفسیر المیزان

۴ تفسیر الکاشف

۵ تفسیر فخر الرازی

۶ فی ظلال القرآن

۷ جواہر الکلام

۸ وسائل الشیعہ

۹ اصول کافی

۱۰ شرائع الاسلام

۱۱ اقتصادنا

۱۲ المحجۃ البیضا

۱۳ منطق القوۃ

۱۴ الحیاۃ

۱۵ دور زیادر فتہ (فارسی)(۱)

۱۶ المعجم المفہرس

۱۷ المعجم المفہرس لالفاظ نہج البلاغہ

۱۸ المنجد

۱۹ مرشد الدعاۃ

۲۰ الدعوت الاسلامیہ

۲۱ ریاض الصالحین

۲۲ حماسہ حسینیؑ (فارسی)(۲)

۲۳ دعوت الاسلام

۲۴ المشکل الاجتماعیہ المعاصرہ

۲۵ خطوات علی طریق الاسلام

۲۶ اصول الدعوۃ

۲۷ ہویۃ التشیع

۲۸ بحار الانوار

۲۹ تاریخ طبری

۳۰ سیرۃ ابن ہشام

۳۱ سیرۃ المصطفیٰؐ

۳۲ خاتم النبیین محمدؐ

۳۳ محمد رسول اللہؐ

۳۴ تاریخ یعقوبی

۳۵ صحیح بخاری

۳۶ حیاۃ امیر المومنینؑ

۳۷ صحیفہ سجادیہ

۳۸ الآداب المعنویہ للصلاۃ

۳۹ منیۃ المرید

۴۰ اخلاق محتشمی

۴۱ الامام الصادقؑ والمذاہب الاربعہ

۴۲ سخنان حسین بن علیؑ (فارسی)(۳)

۴۳ میزان الحکمۃ

۴۴ النہایہ

۴۵ التشریع الجنائی الاسلامی

فہرست

★ عرض ناشر ۱۱

★ مقدمہ ۱۵

مبلغ کون اور اس کی ضرورت ۱۷

موجودہ کتاب ۱۸

★ بابِ اول ۔ ضرورتِ عمل کی وجوہات ۱۹

تمہید ۲۰

ضرورتِ عمل کی وجوہات ۲۳

عمل کی تعریف ۲۳

پہلی وجہ ۔ عقل کی روشنی میں ۲۵

دوسری وجہ ۔ نقلی دلیل ۲۷

تیسری وجہ ۔ اسلامی نظام کی جاویدانی ۳۲

پہلا نکتہ ۔ توحید کا اقرار ۳۴

دوسرا نکتہ ۔ صرف خدا کی پرستش ۳۶

تیسرا نکتہ ۔ اللہ کی حاکمیت ۳۸

چوتھی وجہ ۔ امربالمعروف و نہی عن المنکر ۴۲

امربالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت ۴۴

ایک اور پہلو ۵۰

اجتماع کے بارے میں قانونِ الٰہی	۵۳
اہم معروف و منکر	۵۴
پانچویں وجہ - ذمہ داری	۵۵
خلافت کے تقاضے	۵۸
چھٹی وجہ - تمدنی ضرورت	۶۱
صرف اسلام نجات دہندہ نظام	۶۳
دعوتِ اسلامی سنتِ انبیاءؑ سیرتِ اولیاء	۶۵
داعی کا مقام	۶۷
★ بابِ دوم - عمل نہ کرنے کے بہانے	۶۹
پہلی وجہ کی تفصیل اور اس کا جواب	۷۱
نظریہ ظہور مہدیؑ	۷۲
نظریہ مہدیؑ کے منکرین	۷۲
نظریہ مہدیؑ کے قائلین	۷۵
تقیہ کا مفہوم	۷۸
تقیہ کے مفہوم کی وضاحت	۷۹
تقیہ ذریعہ جہاد	۸۱
تقیہ اور عملی تبلیغ	۸۱
تقیہ کے مثبت اثرات	۸۴
خلاصہ کلام	۸۵
دوسرا بہانہ - صرف علماء کی ذمہ داری ہے	۸۶
علماء کی اقسام	۸۸
تیسرا بہانہ - امکانات کی قلت	۸۹
چوتھا بہانہ - دورِ حاضر میں اسلامی عمل بے سود ہے	۹۰

پانچواں بہانہ ۔ زہد و تقویٰ کا تقاضا ۹۱

چھٹا بہانہ ۔ مادی مفادات ۹۲

ساتواں بہانہ ۔ گھریلو مسائل ۹۳

★ بابِ سوم ۔ عمل کی اقسام ۹۵

۱۔ فلاحی عمل (سماجی بہبود) ۹۶

ہمارا موقف ۹۷

۲۔ اصلاحی عمل ۹۹

ہمارا موقف ۹۹

۳۔ انقلابی عمل ۱۰۰

انقلاب کی اقسام ۱۰۲

ہمارا موقف ۱۰۲

یہ انقلاب کیونکر وجود میں آسکتا ہے۔ ۱۰۴

فکر و طرزِ فکر میں انقلاب، تصورات و مفاہیم میں انقلاب ۱۰۵

ارادہ و عمل میں استحکام ۱۰۹

انفرادی تبدیلی پھر معاشرتی انقلاب ۱۱۱

انقلابی عمل کے وسائل ۱۱۳

مارکس کا نظریہ ۱۱۳

پارلیمانی نظام کے حامیوں کا نظریہ ۱۱۴

اسلام کا نظریہ ۱۱۴

شدت اور تصادم کا طریقۂ کار ۱۲۰

موردِ اول (اسلام کے تقدس کا دفاع) ۱۲۰

موردِ دوم (جابر حاکم کے خلاف) ۱۲۱

موردِ سوم (خارجی دشمن سے مقابلہ) ۱۲۱

مورد چہارم ۱۲۲

خلاصۂ کلام ۱۲۳

اندرونی انقلاب کی حد اور مقدارِ ضرورت ۱۲۳

★ بابِ چہارم ۔ انفرادی عمل یا گروہی عمل ۱۲۷

ہمارا موقف ۱۲۹

انفرادی عمل کے مثبت اور گروہی عمل کے منفی پہلو ۱۳۰

گروہی عمل کے مثبت اور انفرادی عمل کے منفی پہلو ۱۳۱

خلاصۂ کلام ۱۳۵

معاشرہ کی تعمیر میں فرد کا کردار ۱۳۶

★ بابِ پنجم ۔ مراحلِ عمل ۱۴۱

مرحلۂ اول ۱۴۴

مرحلۂ دوم ۱۴۶

کوہ صفا سے تبلیغ عام ۱۴۷

مرحلۂ سوم ۱۴۸

دو اہم نکات ۱۴۹

★ بابِ ششم ۔ اسلوبِ عمل (کیفیت اور طریقۂ کار) ۱۵۱

تبلیغ کا غیر حکیمانہ انداز ۱۵۵

قرآنی ہدایت ۱۵۶

۱۔ مخاطب کے جذبات کا احترام ۱۵۸

آیات کی تشریح ۱۵۹

۲۔ آغازِ کار ۱۶۰

۳۔ مخاطب کے نفسیات کا لحاظ رکھنا ۱۶۴

۴۔ سختی نہیں نرمی ۱۶۴

۵۔ اختلافی مسائل سے گریز	۱۶۶
دو جید علماء کرام کے خیالات	۱۶۷
۶۔ غیر مناسب ردِ عمل	۱۶۸
★ بابِ ہفتم۔ مبلغ کی صفات	۱۷۱
۱۔ تقوی و اخلاص	۱۷۳
۲۔ ذاتی مفادات کی قربانی	۱۷۴
۳۔ غیر خدا سے خوف نہ کھانا	۱۷۸
۴۔ استقامت	۱۷۹
۵۔ اظہارِ حق	۱۸۲
۶۔ خود سازی	۱۸۴
۷۔ تعمیری تنقید	۱۸۵
۸۔ انکساری	۱۸۷
۹۔ لوگوں سے مادی توقع نہ رکھنا	۱۸۹
۱۰۔ فراخ دلی کا مظاہرہ	۱۹۰
۱۱۔ نظام الاوقات	۱۹۴
۱۲۔ باہمی تعاون	۱۹۵
۱۳۔ یاس و ناامیدی سے اجتناب	۱۹۵
۱۴۔ انتھک جدوجہد	۱۹۸
۱۵۔ آگاہی و شناسائی	۲۰۰
الف۔ اسلام شناس	۲۰۰
ب۔ خود شناس	۲۰۱
ج۔ زمانہ شناس	۲۰۳
د۔ دشمن شناس	۲۰۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

خداوند عالم نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے پسندیدہ دین اسلام کے ساتھ مبعوث فرمایا۔

دین اسلام رہتی دنیا تک ہر زمانے اور ہر خطۂ زمین پر بسنے والوں کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام امور رضائے رب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسلامی احکام و فرامین کی پیروی میں انجام دے' یہی بندگیٔ رب ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اسلام کی دعوت اور اس دینِ حقہ کی تبلیغ و ترویج کے لئے سخت ترین مصائب برداشت کئے اور آخرکار شدید زحمات کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں ایک اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ یہ مملکت ان معنوں میں اسلامی نہ تھی کہ اس میں رہنے والوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی جیسا کہ آج اکثر اسلامی ممالک اس لئے اسلامی کہلاتے ہیں کہ ان میں رہنے والے اکثر مسلمان ہیں بلکہ اس مملکت کو اس لئے اسلامی کہا جاتا ہے کہ وہاں قرآن بحیثیت دستور نافذ تھا' اسلامی احکام و فرامین قانون کی حیثیت رکھتے تھے' اسلامی اخلاق و ثقافت کا دور دورہ تھا اور معاشی و اقتصادی امور

شریعت کی روشنی میں حل کئے جاتے تھے۔

لیکن افسوس زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ آسمانی قوانین کی جگہ انسانی فرامین نے لے لی اور رفتہ رفتہ نوبت یہ آپہنچی کہ اسلامی احکام اور قرآنی ارشادات کو طاقِ نسیان کی زینت بنا دیا گیا اور اس کی جگہ رومی و ایرانی اندازِ بادشاہی نے لے لی۔ مرورِ زمانہ نے یہ دن بھی دکھائے کہ آج اکثر اسلامی ممالک پر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین (سرمایہ داری یا کمیونزم) حکم فرما ہیں' مادی اخلاق' مغربی ثقافت اور سودی معیشت کا راج ہے۔

پھر ان ممالک میں اسلامی شریعت اور قانونِ الٰہی کو ترک کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ مسلسل ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں جن کے ذریعے دین اور شعائرِ دینی کی قدر و منزلت ختم کی جائے اور اسلام کو نعوذ باللہ محض ایک فرسودہ نظام اور ازکار رفتہ قوانین و احکام کا مجموعہ قرار دیا جائے۔

.....☆☆.....☆☆.....

عصرِ حاضر میں جب کہ کمیونزم مکمل طور پر ناکام ہوچکا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی تہذیب مسلسل زبوں حالی سے دوچار ہے ان کے نقائص اور برے نتائج و آثار تیزی سے سامنے آرہے ہیں' عالمِ انسانیت ایک ایسے نظام کی تلاش میں ہے جو تمام معائب اور نقائص سے مبرا ہو اور اس میں انسانیت کی مادی اور معنوی تمام احتیاجات کی تسکین کا سامان موجود ہو۔

صرف اسلام ہی خالقِ کائنات کی وضع کردہ شریعت اور ربِ ذوالجلال کے عطا کردہ نظام کی بناء پر اس صلاحیت کا حامل ہے اور رہا ہے کہ انسانیت کے ہر سوال کا جواب دے سکے اور اس کی تمام مشکلات و مسائل میں رہنمائی کرسکے۔

.....☆☆.....☆☆.....

آج عالمِ اسلام میں' اسلام کو ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے دیکھنے والے اور تمام انفرادی اور اجتماعی بیماریوں کی دوا اس کو سمجھنے والے ایسے صاحبانِ ایمان کی ضرورت ہے جو دنیا کو ایک مرتبہ پھر اسلام کی حیات بخش تعلیمات سے روشناس کرائیں اور اس عظیم

مقصد کے لئے تن من دھن سے میدانِ عمل میں اتر پڑیں۔

عالمِ اسلام میں گزشتہ طویل عرصے سے ایسی تحریکوں اور تنظیموں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے جو اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ حیات کے معاشرہ میں رائج اور نافذ کرنے کے لئے سرگرمِ عمل رہی ہیں اور جن کی جدوجہد نے ہم عصر حکمرانوں کی نیندیں حرام کئے رکھیں۔ ان میں سے بعض تحریکوں کے ثمرات اب بھی جاری ہیں۔ بعض اپنا وجود کھو چکی ہیں۔ بعض برائے نام موجود ہیں اور بعض میں اس قدر شدید انحراف پیدا ہوچکا ہے کہ وہ استعماری اداروں کا کردار ادا کررہی ہیں اور اسلامی ممالک میں ان کے مفادات کی ضامن بن چکی ہیں۔

اگر ان اسلامی تحریکوں کی ناکامی کی وجوہ کا جائزہ لیا جائے تو ان کا خلاصہ مندرجہ ذیل تین نکات کی صورت میں کیا جاسکتا ہے۔

☆ ان تحریکوں کے اسلامی کاز کے لئے وجود میں آنے کے باوجود ان کے رہبران و ارکان دین سے کما حقہٗ آشنا نہ تھے جس کی بنا پر یہ بہت جلد انحراف کا شکار ہوگئیں۔

☆ ان تحریکوں کی ناکامی کی ایک اور وجہ حبِ جاہ و مقام اور شہرت و دنیا طلبی تھی۔ جس کی بنا پر اعلیٰ افکار و نظریات رکھنے کے باوجود یہ مقصد و نصب العین سے دور ہوتی چلی گئیں۔

☆ بعض اسلامی تحریکوں کی ناکامی کی وجہ استعماری اثر و رسوخ اور اس کا قوت و غلبہ بھی ہے جس کی بدولت ان تحریکوں کو طاقت و قوت کے بل بوتے پر کچل دیا گیا۔

.....☆☆.....☆☆.....

ہماری رائے کے مطابق اسلامی تحریکیں اسی صورت میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہیں جب ان کے رہبروں اور اراکین کے دل حبِ دنیا سے خالی ہوں' اور ان کی روش اور اسلوبِ کار سیرتِ انبیاء اور شیوۂ ائمہؑ کے مطابق ہو۔ بدقسمتی سے اس وقت بھی ہمارے معاشرہ میں ایسی تنظیموں کی کمی نہیں جو اسلامی نظام کے نفاذ کی دعویٰ دار تو ہیں لیکن اگر ان کے اندازِ کار کا جائزہ لیا جائے تو اس میں نہ تو شریعت کی پیروی دکھائی دیتی

ہے اور نہ ہی انبیاءؑ و ائمہؑ کے طریقۂ دعوت و تبلیغ کی جھلک نظر آتی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف لادین سیاست کے حربے اور خلافِ شریعت اعمال نمایاں ہوتے ہیں۔

.....☆☆.....☆☆.....

حجتہ الاسلام والمسلمین شیخ محمد حسن صلاح الدین مدظلہ نے ایسی تنظیموں کے اراکین اور داعیانِ دین کے لئے یہ کتاب تالیف کی ہے جن کا نصب العین اسلامی معاشرہ کا قیام، اسلامی قوانین کی حکمرانی، اور فرامینِ الٰہی کا نفاذ ہے۔ کتابِ ہذا میں آپ نے آیاتِ قرآن اور فرامینِ معصومینؑ کی روشنی میں ان مسائل کی وضاحت فرمائی ہے جن کا جاننا اور سمجھنا ایک داعیٔ دین کے لئے ضروری ہے۔ خداوندِ عالم آپ کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

آخر میں ایک وضاحت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ عربی زبان میں لفظ "عمل" دعوت و تبلیغ اور انقلابی جدوجہد کے لئے رائج ہے۔ کتابِ ہذا میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

قارئین کی آراء و تجاویز کا منتظر۔ ادارہ

☆—☆—☆

مقدمہ

(۱)

یہ ایک مسلمہ امر اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ کسی نظریہ، نظام اور مکتبِ فکر کی بقاء اس کی تشہیر و تبلیغ (Propaganda) میں مضمر ہے جتنی تبلیغ و تشہیر زیادہ اور طاقتور ہوگی اتنی ہی اس نظریہ کے دائرہ قبولیت میں وسعت اور اس کے اثر میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

تاریخِ ادیان و مکاتب میں ایسے متعدد مذاہب، مکاتب، نظریات اور انسانوں کے ساختہ و پرداختہ نظاموں کا ذکر ملتا ہے جو اپنے فکر و فلسفہ کی قوت، خوبیوں یا صلاحیت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ قوتِ تبلیغ اور پروپیگنڈے کے بل پر پروان چڑھے اور انہیں انسانی سماج میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور پھر ان میں سے بعض نے تو ایک مستقل مذہب اور معاشی و سیاسی مکتبِ فکر کی صورت اختیار کرلی۔ حالِ حاضر میں ایسے ہی مکاتبِ کی مثال کارل مارکس کے نظریات پر مبنی نظام کمیونزم ہے۔ جو تقریباً ستر (۷۰) سال تک زور و زر اور گمراہ کن پروپیگنڈے کے زور پر انسانیت پر مسلط رہا اور بالآخر اسے انسانی مسائل کے حل سے عاجزی و ناتوانی کا برملا اعلان کرنا پڑا۔

دشمنانِ اسلام نے اپنے اسلام دشمن نظریات اور عقائد کے پھیلاؤ اور ان کی ترویج

کے لئے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی انہوں نے ہر حربے اور ذریعہ سے کام لیا اور یہ عمل مسلسل جاری ہے ۔ اسی طرح کچھ اسلامی فرقے اپنے مخصوص عقائد و نظریات کے فروغ میں بے پناہ دولت خرچ کرتے ہوئے شب و روز کوشاں ہیں ۔

اس کے برعکس مسلمان بطورِ عام اور اس دور میں بطورِ خاص اپنے صحیح اصول و عقائد و نظریات اور مذہب و مکتب کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کی اہمیت سے یا تو بالکل غافل ہیں یا اس اہمیت کے ادراک کے باوجود انہوں نے ذمہ داری کے ساتھ تبلیغی مشن کو آگے بڑھانے میں کماحقہٗ حصہ نہیں لیا۔

لیکن صد شکرِ الٰہی کہ نئی نسل میں صحیح اسلام کی طرف دعوت اور اس کی تبلیغ کی ضرورت کا احساس جس انداز سے ہورہا ہے وہ اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔

ایک طرف :۔ ساری دنیا کی شیطانی طاقتیں اس امر پر متفق و کمربستہ ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

دوسری طرف :۔ ساری انسانیت ہلاکت و تباہی کے دھانے پر کھڑی ہے اب صرف اور صرف نظامِ اسلام، معصوم صفت قیادت اور مخلص رہبری ہی اس کے لئے اسبابِ نجات اور صحیح و جامع حل پیش کرسکتے ہیں ۔

تیسری جانب :۔ ملتِ اسلامیہ میں اسلام خواہی کی حس ، اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت کا احساس اور اسلامی حیات بخش نظام کے مطابق انقلاب برپا کرنے کی آمادگی اور اصلاحِ معاشرہ کی ضرورت کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے ۔

مذکورہ حقائق نیز زیرِ نظر کتاب میں بیان کئے گئے معروضات اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کافی ہیں کہ دورِ حاضر میں دعوتِ اسلام ، تبلیغ آئینِ قرآن ، اصلاحِ معاشرہ یعنی اسلامی عمل کی شدید ضرورت کیوں ہے۔

(۲)

مبلغ کون اور اس کی ضرورت

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت بھی بالکل عیاں ہے کہ مبلغِ اسلام کی اہمیت اور اس کے بلند مقام کا اندازہ لگانا ایک بے حد مشکل کام ہے چنانچہ ہم نے کتابِ ہذا میں اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت بڑی اہمیت اور بے انتہا ضرورت کی حامل ہے کہ مبلغ سے ہماری مراد کیا ہے۔

دراصل مبلغ و داعیٔ اسلام وہ باشعور و بافہم مسلمان ہے جو اسلام فہمی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے احساس کے پیشِ نظر اسلام کی تبلیغ و ترویج، اصلاحِ معاشرہ اور دعوتِ اسلام کے سنگین عمل یا قرآن کی تعبیر کے مطابق امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر انجام دیتا ہے۔

اسلامی نصوص کے مطابق ہر مسلمان کو اسلام کا مبلغ، داعی اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے سرگرم عمل ہونا چاہئے۔ لہٰذا اس کی یہ سرگرمیاں اور تحرک، اسلامی اصول و ضوابط کے سانچے میں ڈھل کر اسلامی روح اور اسلامی رنگ و ڈھنگ میں ظاہر ہونا چاہئے۔ کیونکہ غیر متحرک اسلام نہ اپنی حفاظت کرسکتا ہے اور نہ دوسروں کی اور نہ اپنے پیروکاروں کی رہبری و قیادت سنبھال سکتا ہے۔ چہ جائیکہ پوری انسانیت کی نجات کا باعث بنے۔ چنانچہ اگر کوئی فرد مسلمان ہو مگر داعی و مبلغ نہ ہو تو اس کے دعویٰ اسلام میں سچائی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنے فرائض کی انجام دہی میں غفلت کے باعث اس نے درحقیقت اسلام سے اعراض کیا اور اس سے اتنی دوری اختیار کی کہ گویا وہ دین ہی سے کنارہ کش ہوگیا۔

اسی طرح اس دعوت و انقلاب اور اصلاحی عمل کے نعرے سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں جس کی بنیاد غیر اسلامی افکار اور اصولوں پر قائم ہو۔ جیسے کہ کمیونزم، سرمایہ داری، قوم پرستی، نسل پرستی اور اسی قسم کے مختلف دوسرے نعروں کے ذریعے اصلاح کے

طلب گار و دعویدار۔ یہ نعرے سراسر غیر اسلامی ہیں۔

اصولی طور پر ہر مسلمان کو داعی ' مبلغ ' انقلابی اور مصلح ہونا چاہئے ۔ مسلمان عالمِ بشریت کی فلاح و بہبود اصلاح اور اس میں عدل و انصاف کے اصولوں قائم کرنے کا ذمہ دار ہے چنانچہ ہر مسلمان' اسلام کے نظریات واصولوں کو اپنی انفرادی اور سماجی زندگی میں نافذ کرنے پر مامور ہے۔

اسلام بذاتِ خود ایک بہترین نظریہ ' ضابطۂ حیات ' اور فکر و اندیشہ اور سوچ و تدبر کا خشک نہ ہونے والا سرچشمہ و منبع ہے۔

اسلام کو حیات بخش و نجات دہندہ نظام کی حیثیت سے پورے معاشرے میں مکمل طور پر نافذ کرنے کا بوجھ ہر فردِ مسلمان پر ڈالا گیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ مسلمان جو اپنی اس ذمہ داری کو انجام دے۔ داعی و مبلغِ اسلام کہلائے گا۔

(۳)

موجودہ کتاب

زیر نظر کتاب میں تبلیغ دین' اصلاح معاشرہ اور سنگین اسلامی فریضے کو انجام دینے والے فرد (مبلغ' داعی' مصلح' انقلابی) کے متعلق چند ضروری مسائل کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے۔ تاکہ اس پر پیچ و خم وادی میں پہلا بار آور قدم ثابت ہو اور مستقبل میں اس گرانقدر اور اہم موضوع کے بارے میں ذمہ دار علماء کرام اور درد مند دانشورانِ ملت تفصیل سے بحث و تحقیق کی خاطر قلم اٹھائیں۔

مولف اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کرنے کو ضروری سمجھتا ہے کہ روزمرہ دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ ضروری اور مطلوبہ مدارک بھی میسر نہ تھے کیونکہ دورانِ تالیف انہیں فراہم کرنا مولف کے بس میں نہ تھا بہرحال قارئینِ کرام سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی قیمتی آرا اور تعمیری تنقید کے اظہار سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔

محمد حسن صلاح الدین

صفر ۱۴۱۱ھ بمطابق ستمبر ۱۹۹۰ء

☆—☆—☆

باب اول

ضرورتِ عمل کی وجوہات

تمہید

اللہ تعالیٰ کے الطافِ وافرہ و عنایاتِ شاملہ میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے بندوں کی ہدایت و ارشاد، فلاح و بہبود کی خاطر اپنے خاص نمائندوں کو کتاب و دستور کے ساتھ بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا۔ انبیاء و رسلِ الٰہی نے اپنے اپنے دور میں پوری قوت اور لازوال جان نثاری کے ساتھ پیام الٰہی اور دین خدا کی تبلیغ کے کام کو انجام دیا اور اس راہ میں بے پناہ مصائب و آلام اور حصولِ رضائے رب کے لئے طرح طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کیں۔

اسی طرح ہر دور میں ان کے ماننے والوں نے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اور ان کی تعلیمات پر عمل اور ان کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر لوگوں نے ادیانِ سماوی کے بارے میں منفی موقف اختیار کیا اور یوں وہ دین خدا کی برکتوں اور رحمتوں سے محروم رہے۔

مگر خداوند عالم کا بحرِ رحمت ہمیشہ موجزن رہا اور بندوں کے لئے اس کے ابوابِ رحمت ہمیشہ کھلے رہے۔

سرکش بندوں اور شیطان صفت انسانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ زمین و آسمان

کے درمیان رابطہ کو قطع کردیں اور رحمت و مغفرت ' ہدایت و معرفت اور تبلیغ و ارشاد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں اور خالق ارض و سماں کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے ۔ ظالم و جابر طاقتور انسان ' کمزور اور مظلوم انسانوں پر مسلط رہیں اور بے دام غلامی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے ۔

ان کے نزدیک اعلیٰ انسانی اقدار ' بلند اخلاقی معیارات ' حق و انصاف ' عدل و مساوات ' آزادی و حریت اور فطرت و جبلت پر مبنی احکام و قوانین کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ وہم و خیال کے عالم میں تراشے گئے اصنام کی پوجا کے عادی تھے۔

پورے کرۂ ارض پر تاریخِ انسانی کے اکثر ادوار پر جہالت و نادانی اور جاہلیت اور ظلم کے سیاہ اندھیرے کا راج رہا۔ گو کہ تاریخ کے ایک مرحلہ کو دورِ جاہلیت سے موسوم کیا گیا ہے لیکن تاریخ عالم کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسم اپنے مسمی سے کتنی مطابقت رکھتا ہے۔

ایسے میں دریائے رحمت رب ایک مرتبہ پھر متلاطم ہوا اور اپنے آخری نبی (حضرت محمد مصطفیؐ) کو ایک ایسے دین کے ساتھ مبعوث فرمایا جو تاقیامِ قیامت انسانوں کی رہبری و رہنمائی کا وسیلہ قرار پایا ۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس احسانِ عظیم کا تذکرہ یوں فرماتا ہے کہ ۔

لقد من اللہ علی المومنین اذبعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتہ و یزکیھم ویعلمھم الکتاب و الحکمتہ و ان کانو امن قبل لفی ضلال مبین

"بے شک اللہ نے مومنین پر احسان کیا جب کہ ایک رسول انہیں میں سے مبعوث کردیا جو ان پر خدا کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے"۔ (سورہ آل عمران ۳ ۔ آیت ۱۶۴)

و ما ارسلناک الا رحمت اللعالمین

"اور اے رسولؐ ہم نے تم کو تمام عالم کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا

ہے"۔ (سورہ انبیاء ۲۱۔ آیت ۱۰۷)

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو ساری انسانیت کی ہدایت و قیادت کی صلاحیت سے متصف ہے اور زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ کی وضاحت کا حامل ہے مادی و روحانی' دنیاوی و اخروی' سیاسی و اقتصادی' فکری و سلوکی پہلوؤں کے سارے مسائل کا موزوں و مناسب حل اس میں ملتا ہے۔

دنیا پر ایک عرصہ تک اسلام و قرآن کی حکمرانی رہی' پھر نہ اسلام کا نام رہا نہ قرآن کا نشان۔ فردی زندگی ہو یا اجتماعی' سیاسی مسائل ہوں یا فکری سب کا سرچشمہ انسان کے خود ساختہ نظریات' خیالات اور نظاموں کو قرار دے دیا گیا۔

مگر انسانیت کو نظامِ الٰہی اور دین خدائی سے انحراف کے نتیجہ میں بدبختی' شقاوت' تباہی و بربادی اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ملا۔

اب انسان کو اپنی انسانیت کی طرف دوبارہ پلٹ آنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ مگر دورِ حاضر میں انسان کو اپنی گم شدہ انسانیت کی طرف راہنمائی' ہدایت اور دعوت کے اہم ترین فریضے کو کون انجام دے اور یہ سنگین اور افضل ترین ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

ظہورِ اسلام کے بعد اس وقت کی جاہلیت کا مقابلہ اور اسلامی نظام' قرآنی دستور اور پیامِ الٰہی کے فروغ' تبلیغ اور دعوتِ اسلامی کے سخت ترین عمل کا بیڑہ اُس دور کے مسلمانوں نے اٹھایا اور اس تبلیغی عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ گمراہ انسانوں کو دوبارہ راہ ملی انہیں فطرت و عدالت و صداقت اور انسانی اقدار جیسے بلند و بالا اوصاف کے سائے میں دوبارہ زندگی گزارنے کا موقع فراہم ہوا اور ظلم و وحشت جہالت و دہشت کے طوفان میں ڈوبی ہوئی کشتی' ساحل نجات تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔

لیکن یہ سلسلہ جاری و ساری نہ رہ سکا۔ دنیا ایک بار پھر ایک ظلمت کدہ میں تبدیل ہوگئی۔ جنگل کے قانون اور درندگی کے نظام نے ایک مرتبہ پھر رواج پایا۔ اخلاق' اقدار اور انسانی حقوق کی پامالی کا دور دورہ ہوا۔ نہ حقیقی مسلمان رہے نہ اسلام اور نہ ہی

قرآن کا عطا کردہ نظام باقی رہا۔

آج پھر ہر فردِ بشر ایک ایسے نظام کا خواہشمند اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہے جو نجات دہندۂ بشریت ' انسانی فلاح و بہبود کا ضامن اور اس کے حقوق کا محافظ ہو (اس موضوع پر بقدرِ ضرورت گفتگو اور اس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔)

ہاں صرف اسلام ہی ایسا ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام مسائل کا جامع حل موجود ہے۔ لہٰذا اسلام کی تبلیغ کے کام اور دعوت کے عمل کو تیزی ' ہم آہنگی اور جامع پروگرام کے ساتھ آگے بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ چنانچہ تبلیغی عمل کی ماہیت اور دورِ حاضر کے نت نئے تقاضوں کے مطابق دعوتی عمل شروع کرنے سے پہلے اس کے سارے پہلوؤں کا بغور جائزہ لینا ازحد ضروری ہے۔ کیونکہ یہ چیز حصولِ مقصد میں کامیابی یا ناکامی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔

(ہم دیکھ رہے ہیں کہ دورِ حاضر میں بہت سے عاشقانِ خدا ' انسانیت اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اسلام کی تبلیغ و دعوت کے عملی میدان میں کمر باندھ کر کود پڑے ہیں۔ مگر تجربے کا فقدان' تبلیغ کے پس منظر سے ناآگاہی اور خالص جذباتیت ایسے عوامل ہیں جو بعض حالات میں تبلیغی کام کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اور اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں

ہم نے مذکورہ حقائق اور دیگر وجوہات کی بناپر تبلیغِ اسلام کے موضوع کے سلسلے میں یہ کتاب تالیف کی ہے تاکہ بعض مبلغانِ دین کے لئے ممدو معاون اور کچھ کے لئے تذکر کا سبب ہو۔)

ضرورتِ عمل کی وجوہات

عمل کی تعریف

اسلامی عمل سے ہماری مراد ہر وہ عمل ہے جو اسلام کی اشاعت' تبلیغِ احکامِ اسلام اور قرآن کی تعلیمات کے مطابق فرد و معاشرہ کی اصلاح و تعمیر اور مظلوم انسانیت کے

حقوق کی بحالی خلاصہ یہ کہ دعوت الی اللہ اور اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے سازگار ماحول بنانے میں مفید و معاون ثابت ہو۔ یا باالفاظ دیگر فرد و معاشرہ کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں مکمل اور بنیادی انقلاب لانے کی سعی۔

یہ کام اور مقصد صرف اور صرف اسلام کے نظام کے نفاذ، قرآن کے فرامین کی تبلیغ و دعوت اور فروغ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کام کو ہم "تبلیغی کام"، "دعوت اسلامی" اور "اسلامی عمل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح اس مقدس فریضے کو انجام دینے والے کو مبلغ، داعی اور انقلابی مسلمان کہتے ہیں۔

یہاں پر شاید کسی کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ آخر اس پر پیچ و خم دور میں اسلامی عمل کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی ـــــ میں بیٹھے بٹھائے اپنی جان کو مصیبت میں کیوں ڈالوں؟ لوگ راہ حق سے دور ہیں، تو رہیں، معاشرے کی اصلاح نہ ہوئی تو نہ ہو ..... میں آخر تکلیفیں کس لئے اٹھاؤں؟ اسلام کی دعوت کا سنگین کام میری طاقت و حیثیت سے بالا ہے۔ یہ کام صرف انبیاء یا ان کے خاص نمائندے جو معصوم تھے انجام دے سکتے ہیں۔ ان کے دل کو اللہ تعالیٰ نے صبر، استقامت، عزیمت، اور توکل کی خاص قابلیت اور تحمل و برداشت کی طاقت عنایت فرمائی تھی، مگر میں اس عنایت سے محروم ہوں۔)

یہ بات درحقیقت ذمہ داری اور مسولیت سے فرار کا بہانہ ہے۔ چنانچہ ہم نے کتاب کے باب دوئم میں ان تمام فضول حیلوں، بہانوں کی تشریح، وضاحت اور ان پر تنقید کی ہے جو اسلامی عمل سے کنارہ کشی کے جواز کے طور پر راحت طلب افراد کی جانب سے پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر فی الحال ہم اسلامی عمل کے واجب ہونے کی وجوہات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی وجہ ــــ عقل کی روشنی میں

عقلِ سلیم کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ اگر کوئی فرد کسی نظریہ ' عقیدے یا نظامِ حیات کو دل و جان سے قبول کرتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو تو اس عقیدے ' نظریہ یا نظام کی حفاظت اس کے تقدس سے دفاع اور اس کے نفاذ کے لئے جدوجہد کی اہم ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں۔

ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان ہمتِ مردانہ ' محکم ارادے اور عزم بالجزم کے ساتھ میدانِ عمل میں وارد ہو اور سب سے پہلے خود اسلامی تعلیمات اور اسلام کے عطا کردہ نظامِ حیات سے آگاہی حاصل کرے پھر دوسروں کو اس سے روشناس کرائے۔ حتیٰ کہ اسلام کی تبلیغ و ترویج اور دعوت الی الحق کی راہ میں رات دن کوشاں رہے۔ ایک طرف اسلام فہمی کا عمل جاری رہے۔ دوسری طرف حاصل شدہ اسلامی معلومات کی نشرو اشاعت اور مزید فروغ کا کام مسلسل رہے۔ چنانچہ پورے طور پر نظامِ اسلام کا دفاع اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ جب اسلام مکمل طور پر فرد اور معاشرے کے تمام پہلوؤں اور اطراف و جوانب پر حاکم ہو۔

یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ نفاذِ اسلام اور رواج شریعت کا یہ فریضہ سخت محنت اور جہدِ مسلسل کا متقاضی ہے اور بغیر جدوکد اور سعیٔ پیہم کے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا اور خداوندِ عالم خارقِ عادات طریقوں اور معجزات کے ذریعہ اسلامی حکومت کی تشکیل اور اصلاحِ معاشرہ نہیں چاہتا بلکہ یہ کٹھن فریضہ خود مسلمانوں ہی کے کاندھوں پر ڈالتا ہے۔

یا ایھا الذین امنوا ان تنصروا اللہ ینصر کم و یثبت اقدامکم ○

"اے ایمان لانے والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔" (سورہ محمدؐ ۴۷۔ آیت ۷)

و لینصر ن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز

"اور اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا جو خود اللہ کی مدد کرے۔ بے شک اللہ قدرت والا اور زبردست ہے"۔ (سورہ حج ۲۲ آیت ۴۰)

وما امر وا الا لیعبد وا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ویقیموا الصلوۃ ویوتوا الزکاہ و ذلک دین القیمہ

" ان کو کچھ اور حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اللہ کی عبادت کریں خالص بندگی اسی کی کریں (عقائدِ باطلہ سے) ایک طرف رہیں اور نماز پڑھیں اور زکواۃ دیں اور صحیح دین یہی ہے۔ (سورہ بیّنہ ۹۸۔ آیت ۵)

چنانچہ انفرادی زندگی میں اسلام کے بعض احکام و قوانین پر عمل کرنے سے نہ اسلام کی حفاظت و دفاع کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے نہ ہی اسلام کے نفاذ و تطبیق کا یہ مفہوم ہے۔ کیونکہ نامکمل و غیر جامع تطبیق اور اسلامی قوانین میں تفریق کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کے حصول کے لئے اللہ تعالی نے اسلام کو نجات دہندہ نظام کے طور پر نازل کیا تھا۔ یعنی ایک مکمل اسلامی معاشرہ کا قیام تاکہ اس کی برکتوں و رحمتوں سے ہر فرد بشر مستفیض ہوسکے۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط

"بے شک ہم نے اپنے رسول کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت پر قائم ہوجائیں"۔ (سورہ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵)

یہ مقصد اس وقت قابلِ حصول ہے کہ جب اسلامی نظام اور اسلامی اصول و ضوابط کے تحت حکومت کی تشکیل عمل میں آئے۔ تاکہ اس کے نتیجے میں انسانوں کو اخلاقی، سماجی، فکری، تربیتی، تعلیمی اور سلوکی و عملی امراض و انحرافات سے نجات ملے۔ یعنی یہ

علاج اور مادی و روحانی مسائل سے نجات صرف اور صرف اسلامی تعلیمات میں مضمر ہے۔

بنابریں اسلامی نظام کی دعوت پھر اسے معاشرہ پر نافذ کرنا حکمِ عقل کے عین مطابق ہے۔

یہ بات بھی کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنانِ اسلام ہر سطح پر مصروفِ عمل ہیں۔ نظریاتی سرحدوں سے لے کر جغرافیائی سرحدیں تک ان کی یلغار کی زد میں ہیں اور وہ ہر ہتھیار اور ہر ہتھکنڈہ استعمال کر رہے ہیں۔ اب مسلمانوں کو حکمِ عقل و شرع پر عمل کرتے ہوئے ہر قیمت پر اپنے عقیدہ و دین کا دفاع کرنا چاہیئے۔

البتہ اس فرد یا گروہ سے فی الحال ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے کہ جو اسلام کے نفاذ اور اس کے دفاع کی ضرورت کا احساس نہیں کرتا یا اس پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ کیونکہ ایسا شخص اور ایسا گروہ بذاتِ خود اپنے عقیدہ و عقل کا مذاق اڑا رہا ہے۔

دوسری وجہ ـــــ نقلی دلیل

اسلامی عمل کے واجب ہونے، اسلام اور احکامِ اسلام کی تبلیغ کے لازم ہونے اور معاشرتی اصلاح کی ضرورت کے بارے میں آیاتِ قرآنی اور روایاتِ اسلامی کی چند اقسام ہیں۔

پہلی قسم ـــــ مثبت پہلو

اس قسم میں عمل کی ضرورت اور اس کے ذریعہ مرتب ہونے والے مثبت نتائج کا تذکرہ ملتا ہے چاہے یہ نتائج دنیا میں ملیں یا آخرت میں۔

دوسری قسم ـــــ منفی پہلو

اس قسم میں خدا کی طرف دعوت اور تبلیغِ احکام ترک کرنے کی صورت میں منفی

نتائج ۔ عذاب الٰہی اور سزائے اعمال ملنے کا پورا پورا ذکر موجود ہے۔ خواہ یہ عذاب اور سزائیں دنیا میں ظاہر ہوں جیسا کہ سابقہ امتیں ان میں مبتلا ہوئیں ۔ یا ان سے آخرت میں دوچار ہونا پڑے ۔

تیسری قسم

اس آخری قسم میں صرف عملِ اسلامی کا تذکرہ ملتا ہے اور اس کے نتائج کا ذکر نہیں ملتا۔ شاہد کے طور پر ہم چند آیات و روایات کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"ادع الی سبیل ربک بالحکمہ والموعظتہ الحسنہ وجادلھم بالتی ھی احسن"

"تم اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ساتھ ان کو بلاؤ اور ان سے اس طریقہ سے بحث کرو جو بہت ہی اچھا ہو۔" (سورہ نحل ۱۶ آیت ۱۲۵)

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت

" مجھ سے جہاں تک ممکن ہو میں تو صرف اصلاح ہی چاہتا ہوں"۔ (سورہ ہود ۱۱ آیت ۸۸)

لا خیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقتہ او معروف او اصلاح بین الناس ومن یفعل ذالک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نوتیہ اجرا عظیما

" ان کی بہت سی سرگوشیاں کرنے میں کوئی خیر و خوبی نہیں ہے سوائے اس کے جو صدقہ دینے یا نیکی کرنے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کا حکم دے اور جو شخص خدا کی رضا جوئی کے لئے ایسا کرے گا عنقریب ہم اس کو بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔" (سورہ نساء ۴ آیت ۱۱۴)

قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرہ انا ومن اتبعنی و سبحان اللہ و ما انا من المشرکین

"تم یہ کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور وہ جس نے میری پیروی کی ہے بصیرت پر ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" (سورہ یوسف آیت ۱۰۸)

مذکورہ آیات میں دعوت الی الحق' اصلاح معاشرہ اور انبیاء کے ذریعے پیامِ الٰہی کا تذکرہ ہوا ہے۔ پیامِ الٰہی اور مسلکِ انبیاء کا سلسلہ رہتی دنیا تک جاری و ساری رہے گا اور اس میں نسخ و تبدیلی آنے کا کوئی امکان نہیں ہے اس طرح اس پیامِ ربانی کا عمل صرف انبیاء کی ذواتِ مقدسہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کے عام یا خاص نمائندوں کے توسط سے باقی رہ سکتا ہے۔

اسی لئے قرآن مجید میں اس فریضۂ الٰہیہ اور پیام و مشنِ الٰہی پر قائم ہونے والوں کی تعریف و تمجید کی گئی ہے۔

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ و لا یخشون احدا الا اللہ وکفی باللہ حسیبا

"جو خدا کا حکم پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوائے اللہ کے اور کسی سے نہیں ڈرتے اور حساب لینے کو اللہ ہی کافی ہے۔" (سورہ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۹)

دوسری طرف ان افراد کی مذمت کی گئی ہے جو اس امانتِ الٰہیہ کے فروغ و نشر و اشاعت میں یا تو رکاوٹ ڈالتے ہیں یا کم سے کم اس کی راہ میں کوشاں نہیں رہتے۔ چنانچہ ان افراد کی مذمت بھی کی گئی ہے جو معاشرہ میں رونما ہونے والے اوضاع و احوال' منکرات' بدعتوں اور محرمات کے ارتکاب کا سدباب کرنے سے لاتعلق رہتے ہیں۔ یعنی دعوتِ الی اللہ اور اصلاحِ معاشرہ اور حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی راہ میں کوئی جدوجہد نہیں کرتے۔

و اذ ا خذ ا للہ میثاق ا لذین ا وتوا ا لکتاب لتبیننہ للناس و لا تکتمو نہ فنبذوہ وراء ظھورھم

"جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی اس بات کا عہد لیا تھا کہ ضرور تم اس کو تمام آدمیوں سے کھول کر بیان کرنا اور اس کو چھپانا مت مگر انہوں نے اس عہدِ خدا کو پسِ پشت ڈال دیا۔"
(سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۸۷)

فلولا کان من القرون من قبلکم ا ولو ا بقیتہ ینھون عن ا لفساد فی ا لارض ا لا قلیلا ممن ا نجینا منھم واتبع ا لذین ظلمو ا ما اترفوا فیہ و کانوا مجرمین و ما کان ربک لیھلک القری بظلم واھلھا مصلحون

"پس تم سے پہلے زمانوں میں کچھ ایسے صاحبانِ عقل کیوں نہ رہے جو زمین میں فساد و تباہ کاری کرنے سے باز رکھتے گنتی کے لوگ ان میں ضرور ایسے تھے جن کو ہم نے نجات دی اور جو ظالم تھے ان نعمتوں کے پیچھے پڑ گئے جو ان کو دی گئی تھیں ۔ اور وہ مجرم تھے اور تمہارے پروردگار کا یہ قانون نہیں ہے کہ ظلم کرکے بستیوں کو تباہ و برباد کرے جبکہ ان کے باشندے اصلاح طلب ہوں ۔ (سورہ ھود ۱۱ آیت ۱۱۷)

واذ قالت امتہ منھم لم تعظون قوما اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا شدیداً قالوا معذرہ الی ربکم ولعلھم یتقون فلما نسوا ما ذکروا بہ انجینا الذین ینھون عن السوء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون۔

"اور جب ان میں سے ایک گروہ نے یہ کہا تھا کہ تم ان لوگوں کو نصیحت ہی کیوں کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے کہا تھا (ہم تو) تمہارے رب کے حضور میں الزام سے بری ہونے کی غرض سے (نصیحت) کرتے ہیں اور اس لئے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں ۔ پھر جس وقت انہوں نے اس کو بھلا دیا جس کی ان کو نصیحت

کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو بدی سے منع کرتے تھے اور ان کو جو ظلم و نافرمانی کیا کرتے تھے بوجہ اپنے فسق و فجور کے بڑے عذاب میں گرفتار کرلیا"۔(سورہ اعراف ۷ آیت ۱۶۵۔ ۱۶۴)

اس کے برعکس حدودِ خدا یعنی احکام و نظامِ الٰہی کا دفاع کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حقیقی معنوں میں اسلام کا دفاع اس وقت ممکن ہے کہ جب ایک بڑی سیاسی طاقت (حکومت) موجود ہو تاکہ اس طاقت کے ذریعہ بیرونی و اندرونی اسلام مخالف نظریات اور طاقتوں سے مقابلہ کیا جاسکے۔ کسی طاقت کے بغیر دفاع و حمایت کا کوئی مفہوم نہیں۔

الا مرون بالمعروف والناهون عن المنکر وا لحافظون لحدود اللہ و بشر المومنین

"وہ نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے باز رکھنے والے اور احکامِ خدا کی حفاظت کرنے والے ہیں اور انہی ایمان والوں کو خوشخبری سناؤ۔"
(سورہ توبہ ۹۔ آیت ۱۱۲)

اسلامی روایات میں خدا کی طرف دعوت دینے، اصلاحِ معاشرہ کی ضرورت، منکرات و بدعتوں سے مقابلہ اور دیگر ابوابِ فقہ میں مذکورہ مواضع کی اہمیت کے متعلق بے انتہا نصوص پائے جاتے ہیں۔ ہم بوجہ طوالت صرف دو روایات کے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں

"حضرت شعیبؑ نبی پر وحی ہوئی کہ اے شعیبؑ میں تیری امت کے ایک لاکھ افراد کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں جن میں چالیس ہزار بدکردار اور ساٹھ ہزار صلحاء ہیں"۔

حضرت شعیبؑ نے عرض کی پروردگار بدکردار اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں مگر صلحاء کی کیا تقصیر؟ فرمایا! یہ لوگ اشرار و گناہ کاروں کو نصیحت کرنے کے بجائے ان سے لاتعلق رہے۔ اور میرے غیظ و غضب کا پاس نہیں کیا۔ (کافی ج ۵ ص ۵۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صلحاء بذاتِ خود منکرات و جرائم کا ارتکاب نہیں کرتے

تھے مگر ان کی تقصیر اور گناہ و جرم یہ تھا کہ انہوں نے معاشرے میں پھیلے ہوئے منکرات سے مقابلہ اور ان کے انسداد کے متعلق کوئی مثبت رویہ اختیار نہیں کیا۔

"سابقہ امتوں میں کوئی نبی نہیں بھیجا گیا مگر ان کی امت میں کچھ ایسے حوارین اور خاص اصحاب ہوتے تھے جو ان کی سنت و سیرت پر عمل کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایک ایسی نسل وجود میں آئی جو کام وہ خود نہیں کرتی تھی لوگوں کو اسے کرنے کا حکم دیتی تھی اور کچھ ایسے کام وہ بجا لاتی تھی جس پر کوئی شرعی حکم نہ تھا۔ پس جو شخص ان (فساد پھیلانے والے افراد) کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے' اور جو زبان سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے' اور جو قلبی نفرت کے ذریعہ جہاد کرے وہ بھی مومن ہے' ان کے علاوہ کسی میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہوتا۔ (مرشد الدعاۃ صفحہ ۶۷ از صحیح مسلم)

تیسری وجہ ـــــ اسلامی نظام کی جاویدانی

تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک مسلمہ اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام خدا کی طرف سے نازل کردہ آخری دین ہے اور یہ نظام پوری بشریت اور عالمی ہدایت و رہبری کی خاطر اتارا گیا ہے۔ اس کے احکام نہ منسوخ ہوئے ہیں اور نہ ہونے کا امکان ہے۔ رہتی دنیا تک یہی شریعتِ اسلام لوگوں کی فلاح و بہبود کے واحد ذریعہ کے طور پر باقی رہے گی اسلام و قرآن کے اصل متون میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ اور کسی تحریف و غلط تاویل کے بغیر قرآن کریم کی روشن تعلیمات 'خدائی ہدایت کی حامل آیات اپنی اصل شکل میں محفوظ رہنے کی واضح ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون

"بے شک ہم ہی نے ذکر کو نازل کیا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔" (سورہ حجر ۵۔ آیت ۹)

اسی طرح مذکورہ نظامِ الٰہی اور دینِ مقدسِ اسلام ایک خاص گروہ یا محدود زمانے کے

4

لئے نہیں نازل ہوا تھا بلکہ زمانے کے لحاظ سے عہدِ رسولؐ سے لے کر قیامت تک اور افرادِ بنی نوع انسان کے لحاظ سے کسی رنگ و نسل کی تمیز کے بغیر انسانیت کے ہر طبقے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السمٰوات و الارض

"تم کہہ دو اے آدمیوں! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام لانے والا ہوں وہی خدا جس کا اختیار آسمان میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔" (سورہ اعراف ۷۔ آیت ۱۵۸)

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا

"صاحبِ برکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر (حق و باطل کی) جانچ نازل کی تاکہ وہ تمام عالمین کے لئے ڈرانے والا ہو۔" (سورہ فرقان ۲۵۔ آیت ۱)

اس عقیدے کا تقاضہ یہ ہے کہ تعلیماتِ اسلام کی دعوت و فروغ اور اسے نافذ کرنے کا کام جاری و ساری رہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی حجت لوگوں پر تمام ہوجائے۔

رسلا مبشرین و منذرین لئلایکون للناس علی اللہ حجتہ بعد الرسل

"ایسے رسول (ہم نے بھیجے جو) خوشخبری دینے والے بھی تھے اور ڈرانے والے بھی تاکہ ان کے آنے کے بعد کوئی حجت خدا پر باقی نہ رہے۔" (سورہ نساء ۴۔ آیت ۱۶۵)

بنابریں تبلیغِ احکام و نشر معارفِ اسلام کا بڑا اور اہم فریضہ 'گروہی شکل میں انجام پائے یا انفرادی طور پر۔ مگر یہ سلسلہ ضرور باقی رہے۔

اسلامی نظام ' احکام شریعت اور تعلیمات قرآن کے عالمی اور جاویدانی ہونے کے مقاصد کو ہم تین نکات کی صورت میں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

پہلا نکتہ ـــــ توحید کا اقرار

سارا عالم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے کسی غیر خدا کو خالق، رازق اور مالکِ کُل نہ سمجھے۔ یعنی غیر خدا کو خدائی امور میں نہ خدا کا شریک تصور کرے نہ اسے مستقل مقام و حیثیت دے چنانچہ قرآن کریم کا یہی بیان ہے جس کی مختلف الفاظ و تعبیرات سے وضاحت کی گئی ہے۔

ان اللہ فالق الحب والنوی یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی ذالکم اللہ فانی توفکون

"بے شک خدا دانے کا اور گٹھلی کا شگافتہ کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور زندہ کو مردہ سے نکالنے والا ہے۔ وہی اللہ ہے پھر تم کدھر کو بھکے جاتے ہو۔" (سورہ انعام ۶ آیت ۹۵)

ھذا خلق اللہ فارونی ماذا خلق الذین من دونہ

"یہ تو خدا کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں اب تم مجھے یہ دکھاؤ کہ جو اس کے سوا ہیں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے"۔ (سورہ لقمان ۳۱ آیت ۱۱)

ومن ایتہ خلق السمٰوات والارض ومابث فیھما من دابہ وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر

"اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنا بھی ہے اور جتنے چلنے پھرنے والے ان دونوں (زمین و آسمان) میں پھیلا دیئے ہیں اور جس وقت چاہے وہ ان کے جمع کرنے پر قدرت رکھتا ہے"۔

(سورہ شوریٰ ۴۲ آیت ۲۹)

ولئن سالتھم من خلق السماوات والا رض لیقولن اللہ قل افرائیتم ماتدعون من دون اللہ ان ارادنی اللہ بضر ھل ھن کشفت ضرہ اوارادنی برحمتہ ھل ھن ممسکات رحمتہ قل حسبی اللہ علیہ یتوکل المتوکلون

"اور اگر تم ان سے دریافت کروگے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا

کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔ تم کہدو کہ تمہاری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے رہتے ہو آیا یہ اس کے نقصان کو رفع کر سکیں گے؟ یا وہ مجھ پر رحمت نازل کرنا چاہے تو آیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گے؟ تم کہدو کہ میرے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ بھروسہ کرنے والے تو اسی پر بھروسہ کیا کرتے ہیں"۔ (سورہ زمر ۳۹ آیت ۳۸)

ولئن سالتهم من خلق السمٰوات والارض ليقولن خلقهن العزيز العليم

"اور اگر ان سے پوچھو گے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے کہ ان کو اس زبردست صاحبِ علم نے پیدا کیا ہے"۔ (سورہ زخرف ۴۳ آیت ۹)

ان ربكم الله الذى خلق السمٰوات والارض فى ستة ايام

"بے شک تمہارا پروردگار وہی خدا ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں بنایا"۔ (سورہ یونس ۱۰ آیت ۳)

الذى خلق الموت والحيٰوة ليبلوكم ايكم احسن عملا۔

"جس نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں بہتر ہے"۔ (سورہ ملک ۶۷ آیت ۲)

خلق السماوات والارض بالحق و صوركم فاحسن صوركم

"اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تم کو صورت عطا فرمائی ہے تو تمہاری صورتیں کتنی اچھی بنادی ہیں"۔ (سورہ تغابن ۶۴ آیت ۳)

ايشركون مالا يخلق شيئا وهم يخلقون

"کیا ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں"۔ (سورہ اعراف ۷ آیت ۱۹۱)

انتم تخلقونہ ام نحن الخالقون

"کیا تم اس سے آدمی کو پیدا کر دیتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں"۔ (سورہ واقعہ ۵۶ آیت ۵۹)

ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض

"آیا اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا بھی ہے جو آسمان و زمین سے تم کو روزی دے دے؟" (سورہ فاطر ۳۵ آیت ۳)

ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ۔

"بے شک وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ کبھی ایک مکھی بھی پیدا نہ کر سکیں گے خواہ اس کے لئے سب کے سب جمع ہو جائیں"۔ (سورہ حج ۲۲ آیت ۷۳)

والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون۔

"اور اللہ کے سوا جن کو یہ پکارتے ہیں وہ ایک چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے جاتے ہیں"۔ (سورہ نحل ۱۶ آیت ۲۰)

دوسرا نکتہ ـــــ صرف خدا کی پرستش

اسلامی نظام کے عالمی ہونے کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ سارا عالم اللہ تعالیٰ کی عبادت و پرستش کرے چنانچہ یہی عبادت و عبودیتِ خداوندی غرضِ خلقت بھی ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

"اور میں نے جنوں کو اور آدمیوں کو نہیں پیدا کیا مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کیا کریں"۔ (سورہ ذاریات ۵۱ آیت ۵۶)

خدائے لایزال کی پرستش کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ غیر خدا کی پرستش و عبادت کرنا تو درکنار ان کے نام لیوا بھی اس ارض خدا میں باقی نہ رہیں۔ تمام مخلوقات کی حمد و ثناء، تعریف و تمجید، عبادت و پرستش، خضوع و خشوع، تذلل و غلامی صرف اور صرف ذاتِ الٰہی سے مخصوص ہو کیونکہ خدا ہی کی ذات لائق عبادت اور ساری صفات کمالیہ و جمالیہ سے متصف ہے۔ لہٰذا

2

خداوند عالم قرآن کریم میں مختلف الفاظ میں انسان کو یہ تنبیہہ کرتا اور حکم دیتا ہے کہ صرف اس کی عبادت کرو۔

ذلکم اللہ ربکم لا الہ الا ھو خالق کل شئی فاعبدوہ

"وہی تو تمہارا پروردگار ہے کوئی معبود اس کے سوا نہیں۔ وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے"۔ (سورہ انعام ۶ آیت ۱۰۲)

یایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم

"اے لوگو تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا ہے"۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۱)

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبو الطاغوت

"اور بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا تاکہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (و سرکش) سے بچو"۔ (سورہ نحل ۱۶ آیت ۳۶)

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون

"اور ہم نے تم سے پہلے ایک رسول بھی ایسا نہ بھیجا کہ اس کی طرف ہم یہ وحی نہ کرتے رہے ہوں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس تم میری ہی عبادت کرو"۔ (سورہ انبیاء ۲۱ آیت ۲۵)

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون

"بے شک یہ تمہارا گروہ ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ پس میری ہی عبادت کیا کرو"۔ (سورہ انبیاء ۲۱ آیت ۹۲)

الم اعھد الیکم یا بنی ادم ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین وان اعبدونی ھذا صراط مستقیم

"اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم کو یہ حکم نہ دیا تھا کہ شیطان کے بندے نہ بننا، وہ یقیناً تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری عبادت کرنا۔ سیدھا راستہ یہی ہے"۔ (سورہ یاسین ۳۶ آیت ۶۱)

ان اللہ ربی وربکم فاعبدوہ ھذا صراط مستقیم

"بے شک اللہ میرا پروردگار بھی ہے اور تمہارا پروردگار بھی۔ پس اس کی عبادت کرو۔ سیدھا راستہ یہی ہے"۔ (سورہ آل عمران ۳ آیت ۵۱)

حضرت علیؑ بعثتِ رسولِ اکرمؐ کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فان اللہ بعث محمد بالحق لیخرج عبادہ من عبادہ عبادۃ الی عبادتہ و من عھود عبادہ الی عھودہ ومن طاعتہ عبادہ الی طاعتہ ومن ولایتہ عبادہ الی ولایتہ

"بے شک اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کے بندوں کو (قرآن و اسلام کے ذریعہ سے) دوسرے سرکش بندوں کی پرستش سے خدا کی پرستش کی طرف اور بندوں کے عہد و پیمان سے خدا کے عہد و پیمان کی طرف، اور ان کی اطاعت سے خدا کی اطاعت کی طرف اور بندوں کی ولایت و حکومت سے خدا کی ولایت و حکومت کی طرف نکال لے آئیں"۔ (الحیاۃ جلد ا صفحہ ۲۲۵)

اسی سلسلہ میں حضرت امام سجادؑ علیہ السلام کی دعاؤں کے چند فقرے بطورِ شاہد پیش کرتے ہیں۔

اللھم و قو بذالک محال اھل الاسلام، وحصن بہ دیارھم .... حتی لا یعبد فی بقاع الارض غیرک، ولا تعفر لاحد منھم جبھۃ دونک

"اے اللہ اہلِ اسلام کی قوت میں اضافہ فرما ان کے دیار و شہروں کو محفوظ فرما..... تاکہ زمین کے ہر خطے پر صرف تیری پرستش و عبادت کی جائے تیرے سوا کسی اور کے سامنے کسی کی پیشانی خاک آلود نہ ہونے پائے"۔

(صحیفہ سجادیہ دعا نمبر ۲۷)

تیسرا نکتہ ـــــ اللہ کی حاکمیت

اسلامی نظامِ حیات کے عالمی و ہمہ گیر ہونے کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ سارا عالم اللہ تعالیٰ کی

حاکمیتِ مطلقہ کو نہ صرف زبانی اور قلبی طور پر قبول کرے بلکہ اپنے سارے وجود پر اس کی فرماں روائی اور حکومت نافذ کرے۔ سیاسی، اقتصادی، قضائی (عدلیہ)، فکری، سلوکی و عملی غرض ہر میدان میں صرف نظامِ الٰہی یعنی اسلام و قرآن کا حکم قبول کرے کسی دوسرے نظامِ بشری یا تحریف شدہ نظامِ آسمانی یا کسی فرد یا گروہ کی حاکمیت کا تصور تک قریب نہ آنے دے۔ مکمل طور پر غیر خدا کی حکومت کی بساط انفرادی، اجتماعی اور فکری اور اخلاقی زندگی سے الٹا دے تاکہ بشریت مکمل طور پر عدل و انصاف، برابری و برادری کے زریں اصول و ضوابط کے تحت آرام و سکون کی زندگی گزار سکے۔ چنانچہ اسلامی نظام کے آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا اور اس کی طرف قرآن کریم میں متعدد شواہد و دلائل اشارۃً اور صراحتہً پائے جاتے ہیں۔

الا لہ الخلق و الامر

"خبردار اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر"۔ (سورہ اعراف ۷ آیت ۵۴)

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرہ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا

"کسی مومن و مومنہ کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردیں تو اپنے اس معاملے میں ان کے لئے کوئی اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا"۔ (سورہ احزاب ۳۳ آیت ۳۶)

ان الحکم الا للہ

"فیصلہ اور حکم کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے"۔ (سورہ انعام ۶ آیت ۵۷)

ثم جعلنٰک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھوا الذین لا یعلمون

"پھر ہم نے تجھ کو دین کے ایک خاص طریقے پر قائم کردیا پس تو اس کی پیروی کر اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے"۔ (سورہ جاثیہ ۴۵ آیت ۱۸)

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"۔

(سورہ مائدہ ۵ آیت ۴۴)

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں"۔

(سورہ مائدہ ۵ آیت ۴۵)

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون

"اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں"۔

(سورہ مائدہ ۵ آیت ۴۷)

افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون

"کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ یقین رکھنے والوں کے لئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے"۔ (سورہ مائدہ ۵ آیت ۵۰)

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اریک اللہ

"(اے رسولؐ) بے شک ہم نے تمہاری طرف کتابِ برحق اتاری تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو خدا تمہیں دکھلا چکا ہے"۔

(سورہ نساء ۴ آیت ۱۰۵)

افغیر اللہ ابتغی حکما و ھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا

"کیا میں خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو حکم بناؤں حالانکہ وہ وہی ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب نازل کی"۔ (سورہ انعام ۶ آیت ۱۱۴)

اسلام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان اندرونی اور بیرونی سطح پر غیر خدا کی غلامی اور بندگی کی زنجیروں سے آزاد رہے۔ اس کی زندگی کے ہر شعبے پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم رہے۔ نفسِ امارہ کی اطاعت، خواہشاتِ نفسانی کی اسارت، شکم پرستی، شہرت پرستی، مقام و جاہ پرستی اور خود پرستی کے بجائے اپنے نفس کے اندر خدا پرستی، رضائے الٰہی کے

حصول کا شوق اور اللہ کی بندگی اور اللہ کی پرستش کا جذبہ اس انداز سے پیدا کرے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز ناچیز ہو کر رہ جائے۔

اسلام اس لئے نہیں آیا تھا کہ وہ کتب یا فقہاء کے ذہنی و درسی ماحول میں محصور ہو کر رہ جائے اور اس کا وجود نظریات' افکار' مفاہم و تعلیمات کی حدود سے تجاوز نہ کرے یا اسے صرف درس و تدریس اور مدارس دینیہ کی چہار دیواری میں محبوس کیا جائے۔ یا اسے انفرادی زندگی کے معاملات تک محدود سمجھا جائے۔

اسلام کی تعلیمات کا سرسری جائزہ لینے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام بحیثیت ضابطۂ حیات لوگوں کی انفرادی' اجتماعی' فکری اور سلوکی زندگی پر حکومت اور اس کی رہنمائی کی غرض سے آیا تھا۔ تاکہ اس طرح دوسرے سارے مقاصد بھی پورے ہو سکیں۔

زندگی کی مشکلات کا حل' ظلم و استبداد جور و ستم کا خاتمہ' غیر الٰہی مکاتیب سے مقابلہ اور حاکمیتِ الٰہی کی برقراری اس کے نصب العین اور بنیادی اہداف میں شمار ہوتے ہیں۔

ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم

"اور (رسول) ان کے وبال کو اور ان طوقوں کو جو ان کے گلے میں پڑے تھے ان سے دور کرتا ہے"۔ (سورہ اعراف ۷ آیت ۱۵۷)

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط

"بے شک ہم نے اپنے رسول کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت پر قائم ہو جائیں"۔

(سورہ حدید ۵۷ آیت ۲۵)

اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام اور حاکمیتِ الٰہیہ کے مکمل ظہور اور دیگر مذاہبِ عالم پر غالب آنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جس کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون

"وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت و دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے اگرچہ مشرکین کو برا لگے"۔
(سورہ توبہ ۹ آیت ۳۳)

یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ دینِ اسلام کا ظہور و غلبہ' اس کی ترویج و تبلیغ و دعوت کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ یہ تبلیغی عمل ایک طبقہ یا ایک شخصیت یا کسی ایک زمانے سے مخصوص نہیں جیسا کہ آئندہ صفحات میں مزید تشریح پیش کی جائے گی۔

دوسری طرف ابھی تک اسلام کے عالمی ہونے کا عملی ثبوت سامنے نہیں آیا ہے یعنی ابھی اللہ کی حاکمیت کا مکمل دور آیا نہیں۔ غیروں کی عبادت جاری و ساری ہے' بشریت طوق غلامی سے آزاد نہیں ہوئی۔

چنانچہ اسلام کی روح و حقیقتِ نظام اور اس کے انسانی و تشریعی و قضائی مزاج کا یہی تقاضا ہے کہ اس کی دعوت و تبلیغ کا عمل جاری رہے ورنہ خود نظامِ اسلام میں خلل و نقص ثابت ہوگا۔

چوتھی وجہ ـــــ امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی تعلیمات کے دو بڑے اہم ستون تصور کئے جاتے ہیں۔ اس فریضے کی تکمیل کے لئے انبیاء بھیجے گئے' کتب آسمانی اتاری گئیں۔ دین مقدس اسلام کی بقاء' انبیاء عظام کی رسالت و نبوت کے آثار' کتب آسمانی کی تعلیمات کے فائدے اور انسانوں کی ہدایت و گمراہی کا دارومدار ان ہی دو فریضوں سے وابستہ ہے۔

کسی قوم و ملت میں فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر عمل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قوم ابھی تک زندہ ہے۔ اس کی رگوں میں خونِ حیات رواں دواں ہے۔ خیر و نیکی' فلاح و بہبود' ہدایت و ارشاد' سعادتِ دارین کی واضح علامات پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے رحمتِ خداوندی اور عنایتِ خاصۂ الٰہیہ کے دروازے کھلا چاہتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی معاملات صحیح نہج اور صراطِ مستقیم پر رواں دواں ہیں۔ اس کے برعکس مذکورہ فرائض کی فراموشی اور معاشرے میں اس کے نام و نشان تک کا نہ ہونا اس حقیقت کے مترادف ہے کہ وہ معاشرہ یا

قوم زندہ نہیں ہے روحِ حس و شعور اور ذمہ داری اور فریضہ عمل کا احساس مرچکا ہے اور اس قوم کی تباہی و بربادی و زوال و اضمحلال' نیستی نابودی کا وقت آپہنچا ہے۔ ذلت و خواری اور اشرار کی غلامی اور غیروں کا تسلط' اس کی اپنی زمین کے ذخائر و فوائد خود اس کے خلاف استعمال ہونا ایک قطعی حقیقت ہوا چاہتی ہے جس سے اب فرار نہ ممکن ہے۔

مذکورہ فرائض کا ترک کرنا اتنا بڑا جرم اور گھناؤنا فعل ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔

افسوس کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع و عریض زمین اور لاتعداد نعمتوں سے بہرہ ور ہونے والا انسان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کی تبلیغ و دعوت کے عمل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا مگر ہر اس نظریہ یا نظامِ حیات کے دفاع اور اس کی تبلیغ و ترویج میں ہمہ تن غرق رہتا ہے جس میں اس کی ہلاکت ہے گو وہ اسے درک نہیں کرتا۔

اسلام نے امر بالمعروف، نہی از منکر کے دو فریضے اس لئے واجب کئے ہیں تاکہ ایک طرف نظامِ اسلام اور تعلیماتِ قرآن کے مفاد اور بقا کا سامان فراہم کرسکے۔ دوسری طرف ہر دور' ہر خطے اور ہر ملک میں بسنے والے انسانوں کی نجات' فلاح' ہدایت اور انفرادی و اجتماعی سطح پر فکری' سلوکی اور اخلاقی اصلاح کا اہم ترین عمل کسی وقفہ کے بغیر جاری و ساری رہے۔ کسی قسم کا انحراف مسلمانوں کے اندر پیدا نہ ہونے پائے اور امت اسلامیہ کے اندر ہر بیرونی یلغار سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور قوت مدافعت باقی رہے۔ مسلمانوں میں وحدتِ فکر و وحدتِ عمل کی فضا ہمیشہ موجود رہے۔ برادری کا سبق' مساوات کا درس' ہر عمل و حرکت میں تقویٰ کو کسوٹی قرار دینے کی رسم' ایک دوسرے کی مدد و مساعدت کا جذبہ' خدمتِ خلق کی ترویج' دوسرے مسلمانوں کی مشکلات کے حل میں عملاً بھرپور حصہ لینے کا شوق' دین خدا کی تبلیغ و ترویج اور اسلامی حکومت کا قیام' ہر برائی سے خود اجتناب کرتے ہوئے دوسروں کو اجتناب کرنے کی تلقین اور تمام انحرافات اور ہر فساد سے مقابلہ۔ غرض تمام معروفات اور نیکیوں کی نشر و اشاعت اور تمام منکرات اور بدیوں سے روک ٹوک کا عنصر ہر مسلمان کے دل میں بحیثیت ایک اسلامی فریضے کے راسخ ہو اور اسی عمل کا نام اسلامی عمل یا دعوت الی اللہ اور دین مقدس اسلام کی تبلیغ و ترویج ہے۔ کوئی مسلمان یہ عقیدہ نہیں رکھتا کہ امر بالمعروف و

نہی از منکر کا فریضہ مسلمانوں سے ساقط ہے۔ یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ عملی میدان میں اس فریضہ کی بجا آوری کم ہی دیکھنے میں آتی ہے مگر نظریاتی طور پر اسے تسلیم تو سب ہی کرتے ہیں۔

بنا بریں کیا دعوت اسلامی اور عملِ اسلامی سے بڑھ کر اور کوئی معروف ہے؟ اسی طرح اس عظیم فریضۂ خداوندی کے ترک کرنے سے زیادہ خطرناک اور بڑا کوئی منکر ہے؟

اصل معروف اور دیگر معروفات کے لئے بنیادی حیثیت صرف دعوت الی اللہ اور اسلامی عمل کے معروف کو حاصل ہے۔ کیونکہ دعوتِ اسلامی اور عملِ اسلامی ایک وسیع عنوان وہمہ گیر موضوع ہے جس کے تحت 'معروف کے سارے فروعات و جزئیات جیسے نماز' روزہ' حج' اطاعت والدین' احسان' ایثار وغیرہ آتے ہیں۔ اسی طرح نہی از منکر کے سارے جزئیات مذکورہ عنوان اور اسلامی عمل کے ضمن میں شامل ہیں۔ کیونکہ اسلامی عمل کا دائرہ کار کسی ایک منکر اور کسی ایک بدی سے روکنے پر محدود نہیں ہے بلکہ تمام اہم اور غیر اہم منکرات اور ناپسندیدہ اعمال و افعال سے وابستہ ہے۔ لہٰذا انفرادی زندگی میں پائے جانے والے انحرافات و منکرات سے لے کر اجتماعی سطح کے سارے منکرات و انحرافات سے مقابلہ کرنا اسلامی عمل کا نصب العین ہے۔

اس عظیم اسلامی فریضے کی اہمیت و افادیت کی وضاحت فی الحال ہم صرف دو طریقوں سے کرتے ہیں۔

★ ایک اس کے وجوب ولزوم کے دلائل کے بیان سے۔

★ اور دوسرے اس کے ترک کرنے کی بنا پر مرتب ہونے والے خطرناک نتائج کی نشاندہی سے۔

امر بالمعروف و نہی از منکر کی اہمیت

اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر بعض علماء کے نزدیک واجبِ عقلی ہے اور وجوبِ سمعی (نقلی) اس کی تاکید میں مزید اضافے کا موجب ہے (جواہر

الکلام ۲۱ر ۳۵۸۔ شرح لمعہ ۲ر ۴۰۹ منطق القوۃ ۵۷) ہم یہاں محض ان آیات و روایات کے بیان پر اکتفا کریں گے جو امر بالمعروف اور نہی از منکر کی اہمیت کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔

ولتکن منکم امتہ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون۔

"اور لازم ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں جو نیکی کی طرف بلائیں اور اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے منع کریں اور وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۰۴)

کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر

"تم بہترین امت ہو (اور تمہاری افضلیت اسی بناء پر ہے کہ) نکالے گئے ہو لوگوں کی بھلائی کے لئے، تم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرتے اور برے کاموں سے روکتے ہو"۔ (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۱۰)

دونوں آیتوں میں ایک ہی مضمون پر تاکید کی گئی ہے اور دونوں مندرجہ ذیل امور کی وضاحت پر مشتمل ہیں۔

۱:۔ لفظ (منکم) یعنی "تم میں سے" اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی از منکر مومنین میں سے ایک گروہ کا کام ہے۔ گویا اس فریضہ کے انجام دینے کے شرائط جو عامل و آمر و ناہی میں ہونا لازمی ہیں صرف ایک گروہ ان اوصاف سے متصف ہے لہٰذا یہی گروہ اس فریضہ کی انجام دہی کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دیگر مسلمانوں سے یہ فریضہ ساقط ہے۔ کیونکہ واجبِ کفائی کا مطلب یہی ہے کہ ایک گروہ کی جانب سے کوئی کوتاہی و قصور سرزد ہونے کی صورت میں سارے مسلمانوں سے مواخذہ کیا جائے گا۔

جیسے کہ مشہور حدیث رسولؐ ہے۔

کل راع و کل مسوول عن رعیتہ

"تم سب نگہبان ہو اور ہر ایک سے اپنی نگہبانی کے دائرے کے تحت سوال کیا جائے گا"۔

۲:۔ ایک گروہ کو تیار رہنے کی تلقین کے تاکیدی حکم سے معروف پر حکم و منکرات سے منع کرنے کی اہمیت کا واضح ثبوت ملتا ہے شاید یہ اسلامی فرائض و احکام میں واحد فریضہ ہے جس کی تعمیل و بجا آوری کے لئے ایک تربیت یافتہ اور باشرائط افراد کے گروہ کی تشکیل کا براہ راست حکم دیا گیا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر یہ بات کہنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی کہ اگر اسلام کے اصول و نظریات پر عمل کرنے کی دعوت کو معروفات میں اور اس سے انحراف کرنے کے کام کو منکرات میں شمار کیا جاتا ہے تو لا محالہ اسلام کے اصول و فروع سے روشناس کرانا' پھر انہیں ساری زندگی پر حاکم بنانے کی سعی و کوشش اور اسلامی حکومت کی تشکیل کی دعوت کا مسلسل عمل سارے معروفات سے اعلیٰ و اشرف و برتر مقام و مرتبہ کا حامل ہے۔

اسی طرح اسلامی اصطلاح میں معمولی نوعیت کے برے کام اور انفرادی حیثیت کی بدعتوں سے مقابلہ کرنا' اگر نہی از منکر میں شامل ہے تو عالمی کفر' طاغوتی نظاموں اور جاہلیت سے مقابلہ و نبرد آزما ہونا تاکہ ان نظاموں اور نظریات کو بنیادوں سے گرا کر اسلامی نظام کی پر شکوہ عمارت کھڑی کی جائے یقیناً بغیر کسی شک و تردید کے نہی از منکر کے عنوان میں شامل ہے۔

۳:۔ پہلی آیت میں (دعوت الی الخیر) کا جملہ مذکور ہے پھر امر بالمعروف و نہی از منکر کو بیان کیا گیا ہے دعوت الی الخیر کا تذکرہ اہم ترین اور افضل ترین اسلامی عمل کی قرآنی تربیت اور تحریک و تبلیغ کے حکیمانہ اسلوب اور منطقی انداز نشر و اشاعت کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ کام ازبس ضروری اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ لوگوں کو کسی فعل وحرکت یا نظریہ کے بارے میں امرونہی کرنے سے پہلے انہیں خیروخوبی کی دعوت دی جائے اس کے حدود۔دائرے 'اور اوصاف سے روشناس کرایا جائے۔ تاکہ لوگوں میں خیروشر' حق وباطل 'نیکی وبدی اور نفع و نقصان کے درمیان تفریق کی صلاحیت اور قوتِ فیصلہ کی خاصیت پیدا ہوسکے۔

احکامِ الٰہی اور اوامرونواہی اور اسلام کے حدود وضوابط سے تجاوز کرنے والوں کو منع کرنے یا اوامرونواہی کے سلسلہ میں کوتاہی کرنے والوں پر ان کی تعمیل کا حکم صادر کرنے سے پہلے عاقلانہ اور درست حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو خود اسلامی عقائد' اخلاق' افکار' احکام اور دیگر سارے معاملات کی طرف مائل اور متوجہ کیا جائے۔ اسلام کے اساسی اور بنیادی مسائل سے لے کر روزمرہ کے معمولی معمولی امور تک کے تعلق سے ایسی فضا اور ماحول سازگار کیا جائے کہ لوگ ذہنی طور پر انہیں قبول کرنے پر تیار ہوجائیں۔لوگوں کو اسلامی نظام کے نفاذ اور احکام وتعلیمات الٰہی پر عمل سے مرتب ہونے والے مثبت نتائج کی جانب متوجہ کیا جائے اور دینِ مقدسِ اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کیا جائے۔اس مرحلہ کے بعد امربالمعروف اور نہی از منکر کی نوبت آتی ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات باآسانی ذہن نشین ہوجاتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ دعوتِ حق کا فریضہ یعنی اسلامی عمل 'اصلاحِ معاشرہ اور ہرخیروخوبی سے روشناس کرانے کا کام دائمی طور پر جاری وساری رہے گا۔چنانچہ لفظ "خیر" کا اتنا وسیع اور گہرا مفہوم ہے کہ مبداوتوحید کے مسائل سے لے کر قیامت ومعاد کے مسائل تک اس کے احاطہ میں آسکتے ہیں۔

عقائد، اخلاق، نظریات و افکار جس طرح مفہوم خیر کے مصادیق میں شمار ہوتے ہیں اسی طرح عملی میدان میں انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی اصلاح، فکر و عمل کی تطہیر اور ہر نیک جدوجہد اور نیک ذریعہ جو انسانیت کے لئے ترقی و کمال کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو "خیر" کے ضمن میں آتا ہے۔

دعوت الی الخیر کا ہمہ جہتی کام مسلسل جاری و ساری رہنا چاہئے۔ تاکہ ایک طرف تو عالمِ انسانیت کو اسلام کی ارفع و اعلیٰ تعلیمات سے روشناس کرایا جاسکے اور دوسری طرف دعوتِ حق کو آگے بڑھاتے ہوئے طاغوتی افکار و نظریات اور لادین مغربی تہذیب و تمدن کے مضرات اور تباہ کن اثرات سے لوگوں کو آگاہ کیا جاسکے۔

اب ہم اس سلسلہ میں مزید آیات نقل کرتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی از منکر کی اہمیت و وجوب کے متعلق اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ان افراد کی تعریف و تمجید کی ہے جنہوں نے اس فریضہ کو انجام دیا۔ اس کے علاوہ حضور اکرم (ص) کے اوصاف و فرائضِ منصبی میں سے ایک امر بالمعروف و نہی از منکر کو شمار کیا گیا ہے۔

لیسوا سواء من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون ایات اللہ اناء الیل و ھم یسجدون یومنون باللہ والیوم الاخر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات واولئک من الصالحین۔

"سب برابر نہیں ہیں اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ ثابت قدم ہے جو راتوں کو آیاتِ خدا پڑھتے ہیں اور سجدے کیا کرتے ہیں۔ وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نیکی کا حکم کرتے ہیں اور بدی سے منع کرتے ہیں اور نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھنے میں کوشش کرتے ہیں۔ اور یہی لوگ صلحاء میں سے ہیں۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۱۳۔۱۱۴)

لاخیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلح بین الناس و من یفعل ذالک ابتغاء مرضات اللہ فسوف نوتیہ اجرا عظیما

"ان کی بہت سی سرگوشیاں کرنے میں کوئی خیر و خوبی نہیں ہے سوائے اس کے جو صدقہ دینے یا نیکی کرنے یا لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے کا حکم دے اور جو شخص خدا کی رضا جوئی کے لئے ایسا کرے گا عنقریب ہم اس کو بہت بڑا اجر عطا کریں گے۔" (سورہ نساء ۴ آیت ۱۱۴)

یابنی اقم الصلوٰہ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علی ماصابک ان ذالک من عزم الامور

"اے میرے بیٹے نماز پڑھ اور نیکی کا حکم دے اور بدی سے باز رکھ اور جو مصیبت تجھ پر پڑے اس پر صبر کر یقیناً پختہ ارادے کے کاموں میں سے یہ بھی ہے"۔ (سورہ لقمان ۳۱ آیت ۱۷)

والمومنون والمومنات بعضھم اولیا بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر و یقیمون الصلوٰۃ ویوتون الذکوٰۃ ویطیعون اللہ و رسولہ اولئک سیرحمھم اللہ ان اللہ عزیز حکیم"۔ (سورہ توبہ ۹ ایت ۷۱)

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حامی اور ولی ہوا کرتے ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے منع کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ عنقریب اللہ ان پر رحمت کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست حکمت والا ہے"۔

الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ و بشرالمومنین

"(مومنین) نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے باز رکھنے والے اور احکامِ خداوندی کی حفاظت کرنے والے ہیں اور ان ہی ایمان والوں کو خوشخبری سناؤ۔" (سورہ توبہ ۹ آیت ۱۱۲)

یا مر ھم بالمعروف و ینھا ھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم

علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والا غلال التی کانت علیھم"

"(نبی امی) ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے باز رکھتا ہے پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال قرار دیتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے وبال کو اور ان طوقوں کو جو ان کے گلے میں پڑے تھے ان سے دور کرتا ہے۔" (سورہ اعراف ۷ آیت ۱۵۷)

ایک اور پہلو

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی افادیت و ضرورت کے استدلال کا دوسرا پہلو اس بات کے جائزے پر مشتمل ہے کہ اس فریضہ کے ترک کرنے پر کیا کیا سنگین اثرات اور نامطلوب نتائج مرتب ہوسکتے ہیں۔ تارکینِ فریضہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا اور اسلامی روایات میں اس فریضے پر عمل نہ ہونے کی صورت میں کیا کیا پیش گوئیاں اور کن تباہ کن نتائج کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قرآن کریم کی صریح آیات، صحیح و معتبر روایات اور سنت و قانونِ الٰہی کو سامنے رکھتے ہوئے گذشتہ امتوں کے حالات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ:

(۱) سابقہ امتوں کی تباہی، ہلاکت اور عذابِ خداوندی میں مبتلا ہونے کا سبب خود ان امتوں کا اپنا کردار اور امرِ الٰہی کی عدم تعمیل اور نواہی و منکرات کا بے تحاشہ رواج تھا۔

(۲) اس تباہی و بربادی کی زد میں صرف مجرم اور گناہ گار افراد ہی نہیں آئے بلکہ اس دور کے صلحاء و ابرار بھی اس بنا پر اس تباہی و بربادی سے دوچار ہوئے کہ وہ خاموشی کے ساتھ مفسدات و انحرافات کو پھلتے پھولتے ہوئے دیکھتے رہے۔

(۳) فریضہ امر بالمعروف و نہی از منکر ترک کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں متعدد بار لعنت فرمائی ہے۔ اگرچہ یہ لعنت سابقہ امتوں کے احوال میں مذکور ہے مگر حکمِ خدا قیامت تک جاری و ساری رہے گا لہٰذا آج بھی جو شخص سابقہ امتوں کے مشابہ ہو وہ بھی خدا کے نزدیک ملعون ہے اور سنگین نتائج سے دوچار ہوگا۔

(۴) سابقہ امتوں کے دردناک انجام، عبرتناک احوال اور اسلامی نصوص کا اجمالی جائزہ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ بے سروسامانی اور زبوں حالی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مذکورہ فریضہ کو خیرباد کہہ دیا اور نا اجتماعی سطح پر اور نا ہی انفرادی سطح پر اس فریضہ کا کوئی وجود برقرار رہا۔ آج بلادِ اسلامی میں منکرات و انحرافات کی کوئی انتہا نہیں جگہ جگہ فسق و فجور، سرکشی اور جہالت کی نئی نئی صورتیں نکل آئی ہیں اور کسی رکاوٹ کے بغیر معاشرتی، خاندانی اور انفرادی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں رواج پا رہی ہیں۔ ظاہر ہے اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا جس سے آج مسلم معاشرہ دوچار ہے۔

زیرِ بحث موضوع سے مربوط بعض آیاتِ قرآنی پیشِ خدمت ہیں۔

لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داود و عیسی ابن مریم ذالک بما عصواو کانوایعتدون کانوالایتنا ھون عن منکر فعلوہ لبئس ما کانوا یفعلون۔

"بنی اسرائیل میں سے جو کافر ہو گئے ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبانی لعنت کی گئی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ زیادتی کیا کرتے تھے۔ جو بدی وہ کرتے تھے اس سے وہ باز نہ آتے تھے۔ ضرور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ بہت ہی برا تھا"۔ (سورہ مائدہ ۵ آیت ۷۸۔۷۹)

فلولا کان من القرون من قبلکم اولو بقیتہ ینھون عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منھم واتبع الذین ظلموااتر فوافیہ وکانوا مجرمین۔

"پس تم سے پہلے زمانوں میں کچھ ایسے باز ماندگان کیوں نہ رہے، جو زمین میں فساد و تباہ کاری کرنے سے باز رکھتے گنتی کے لوگ ان میں ضرور ایسے تھے جن کو ہم نے نجات دی اور جو ظالم تھے ان نعمتوں کے پیچھے پڑ گئے جو ان کو دی گئیں تھیں اور وہ مجرم تھے۔" (سورہ ھود ۱۱ آیت ۱۱۶)

واذ قالت امتہ منھم لم تعظون قوما اللہ مھلکھم او معذبھم عذابا شدیداً قالوا معذرہ الی ربکم ولعلھم یتقون فلمانسوا ما ذکروا بہ انجینا الذین ینھون عن السوء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون۔

"اور جب ان میں سے ایک گروہ نے یہ کہا تھا کہ تم ان لوگوں کو نصیحت ہی کیوں کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے کہا تھا (ہم تو) تمہارے رب کے حضور میں الزام سے بری ہونے کی غرض سے (نصیحت) کرتے ہیں اور اس لئے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں۔ پھر جس وقت انہوں نے اس کو بھلادیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو بدی سے منع کرتے تھے اور ان کو جو ظلم و نافرمانی کیا کرتے تھے بوجہ اپنے فسق و فجور کے بڑے عذاب میں گرفتار کرلیا"۔ (سورہ اعراف ۷ آیت ۱۶۵۔ ۱۶۴)

واذا اردنا ان نھلک قریتہ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنھا تدمیرا وکم اھلکنا من القرون من بعد نوح۔

"اور جب ہم کسی بستی کے ہلاک کردینے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس میں مالداروں کو (اطاعت) کرنے کا حکم دیتے ہیں پس وہ اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں پھر وہ بستی عذاب کی مستحق ہوجاتی ہے پھر ہم اس کو مکمل تباہ کردیتے ہیں اور نوح کے بعد ہم کتنے ہی گروہوں کو تباہ کرچکے"۔ (سورہ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۱۶۔ ۱۷)

المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یامرون بالمنکر و ینھون عن المعروف و یقبضون ایدیھم نسوا اللہ فنسیھم ان المنافقین ھم الفاسقون۔

"منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسرے کے ہم جنس ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے باز رکھتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں وہ اللہ کو بھول گئے ہیں۔ تو اللہ نے بھی ان کو بھلادیا۔ بے شک منافق لوگ ہی تو

نافرمان ہیں"۔(سورہ توبہ ۹ آیت ۶۷)

اجتماع کے بارے میں قانونِ الٰہی

کسی معاشرہ میں افراد کے برے اعمال اور بدکرداروں کی بدی جب تک خود ان کی اپنی ذات تک محدود ہو اور اس کے برے اثرات دوسرے افرادِ معاشرہ پر نہ پڑ رہے ہوں تو ایسی صورت میں دنیا و آخرت میں برے نتائج اور خوفناک عواقب کی زد میں صرف وہی افراد آئیں گے جو یہ اعمال بجالا رہے ہوں۔ یہاں قانونِ الٰہی یہ ہے کہ صرف مجرم کو اس کے کئے کی سزا ملے گی۔

لیکن اگر یہ برے اعمال اور بدعنوانیاں ان افراد کے دائرۂ وجود کو عبور کر کے دوسرے افراد اور کشاں کشاں پورے سماج پر اس طرح اثرانداز ہونے لگیں کہ سماج کا ہر گوشہ ان کی لپیٹ میں آجائے اور ایک طبقہ یا ایک گروہ سے سرزد ہونے والے اعمال پورے معاشرے کا احاطہ کرلیں اور ان کے برے نتائج اور منفی اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہونے لگیں۔ تو ان مفسدات کے نتیجہ میں رونما ہونے والے خطرناک انجام اور عبرتناک عواقب کی زد میں اس دور کے تمام مکلفین اور صاحبانِ عقل آسکتے ہیں۔

گو یہ جرائم اور مفسدات بذات خود ان افراد سے سرزد نہیں ہوئے لیکن کیونکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ معاشرہ میں فساد و انحراف اور بدعنوانیوں کی روک تھام کے سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرے، فاسق و فاجر اور بدعنوان و بدقماش افراد پر نظر رکھے اور امر بالمعروف و نہی از منکر کے فریضے پر عمل پیرا ہو لہٰذا مومنین اور صالح افراد کی خاموشی منحرفین و مفسدین کے ساتھ تعاون کے زمرے میں آئے گی۔ کیونکہ اسی خاموشی کی وجہ سے یہ بلا روک ٹوک فساد و انحراف کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔

واتقوا فتنۃ لاتصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ۔

"اور اس فتنے سے ڈرتے رہو جو خصوصیت کے ساتھ انہی لوگوں پر نہ پڑے گا جو تم میں سے ظالم ہیں"۔(سورہ انفال ۸ آیت ۲۵)

حضرت علیؑ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ ایک گروہ کے اعمالِ بد سے سارے لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک وہ اسے مخفی طور پر انجام دیتا رہے اگر ایک خاص گروہ علیٰ الاعلان جرم و منکرات کا ارتکاب کرے اور لوگ اسے منع نہ کریں تو دونوں فریق (خاص و عام) عقاب و سزا کے مستحق ہوں گے"۔
(وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۰۷)

حضرت امام حسن عسکریؑ اپنے جدِ بزرگوار رسول اللہؐ سے روایت کرتے ہیں کہ۔

"اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ کو ایک شہر کو کہ جس میں کفار و فجار رہتے تھے دھنسا دینے کا حکم دیا جبرئیلؑ نے عرض کی اے پروردگار! "میں ان سب کو نابود کروں گا سوائے اس زاہد کے جو ان کے درمیان ہے۔" خداوند عالم نے جواب دیا۔ "سب سے پہلے اسی کو ہلاک کر کیونکہ اس نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے پر عمل نہیں کیا۔" (وسائل جلد ۱۱ ص ۴۰۷)

آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا۔

"کیا ہمارے درمیان صالحین اور نیک لوگوں کے ہوتے ہوئے ہم ہلاک ہو سکتے ہیں۔ فرمایا۔ "ہاں جب گناہ و نافرمانی حد سے گزر جائے۔" (ریاض الصالحین ص ۹۱)

مذکورہ آیات و روایات کے علاوہ اسلامی کتب اور نصوصِ شرعیہ میں لاتعداد دلائل و براہین پائے جاتے ہیں کہ جن میں امر بالمعروف و نہی از منکر کی اہمیت اور اس کے ترک کرنے کے گھناؤنے جرم کی پاداش میں ہونے والے اور ہو سکنے والے تباہ کن نتائج کا ذکر موجود ہے لہٰذا ان دو اہم اسلامی فریضوں کی روشنی میں دعوتِ حق، اسلامی عمل اور اصلاحِ معاشرہ کا کام ایک عظیم فریضہ ہے۔

اہم معروف و منکر

اسلامی نظام کے مزاج، تعلیماتِ قرآن کی روح اور بعثت انبیاء کی غرض و غایت سے واقف افراد کے سامنے اس عظیم منکر سے بڑھ کر اور کوئی منکر ہو ہی نہیں سکتا کہ نظامِ الٰہی کے بدلے خدا کی زمین میں اللہ کے بندوں پر خود انسان کے بنائے ہوئے نظام حکم فرما ہوں۔ اور نظامِ اسلام و احکامِ قرآن کو فرسودہ نظام قرار دے کر انسانی زندگی سے خارج کر دیا جائے۔

اسی طرح آج کے دور میں اس معروف سے بلند اور بڑا کوئی اور معروف ہو ہی نہیں سکتا

کہ اسلام کو دوبارہ انسانی زندگی پر حاکم بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ بحال ہو۔ یہ ایک ایسا جامع معروف ہے کہ جس کا زندہ رہنا سارے معروفات کی زندگی و بقائے دائمی کی ضمانت ہے اور اسے ترک کرنا اتنا سنگین جرم ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان پھر کوئی رابطہ باقی نہیں رہتا۔ صالح ہو یا طالح، مومن ہو یا منافق، مجرم ہو یا بے گناہ سب کے سب عذاب و سزائے الٰہی کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

فقہائے اسلام نے امر بالمعروف (نیکی کا پھیلاؤ) اور نہی از منکر (بدی کے انسداد) کے فریضے کو اس وقت موضوع بحث و واجب قرار دیا ہے جب کہ عام طور پر اسلامی معاشرہ، اسلامی نظام اور اسلامی بنیادی اصول و نظریات تو محفوظ ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے معاشرتی اور انفرادی زندگی کی سطح پر مختلف قسم کے انحرافات، جزوی طور پر گناہ و معصیت اور عملی و سلوکی میدان میں اسلام کے نظریات و احکام کے خلاف مظاہرہ و نمونے رونما ہوتے ہیں۔ یہاں مذکورہ فریضے کے مطابق ہر فرد مسلمان پر لازم ہے کہ اس بیماری کو انسانیت اور مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی و سماجی پیکر میں سرائیت کرنے سے روکے تاکہ صحت مند معاشرہ کی حفاظت کی جاسکے اور معاشرہ فکری، عملی اور اخلاقی آلودگیوں سے پاک رہے، بیماری اور بیمار عضو کا جلد از جلد علاج کیا جاسکے۔

اگر چھوٹے چھوٹے انحرافات کی روک تھام ایک شرعی فریضہ ہے تو انحرافات و مفسدات کی جڑ اور بنیاد سے مقابلہ کرنا اور بالآخر اسے معاشرے سے اکھاڑ پھینکنا تو بطریقِ اولیٰ اور قطعی طور پر لازم و ضروری ہوگا۔ چنانچہ ہمیں اسلام کے علاوہ ہر نظام سے مقابلہ کرنا ہے کیونکہ فساد کی جڑیں ان تمام نظاموں اور نظریات میں پائی جاتی ہیں جو اسلام کے بجائے ہم پر حکم فرما ہیں۔

پانچویں وجہ ـــــ ذمہ داری

لوگوں کو دعوتِ حق دینا اور معاشرہ میں اسلامی عمل کو آگے بڑھانا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق دیگر تمام ذمہ داریوں

سے اس ذمہ داری کی اہمیت و ضرورت کہیں زیادہ ہے۔

انسان کی عزت و احترام اور دیگر مخلوقات پر افضلیت کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے۔ اس ذمہ داری و مسئولیت سے گریز کی صورت میں وہ فضیلت و شرافت بھی ختم ہو جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نوازا ہے۔

قرآنی تعبیر کے مطابق اس ذمہ داری کا دوسرا نام خلافت و جانشینی ہے۔ یعنی خداوند کریم نے روئے زمین پر اپنی ساری مخلوقات میں سے صرف انسان کو بحیثیت مجموعی اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے اور خلافت الہیہ کا خاص اعزاز اور جانشینی کا عظیم منصب و پروقار مقام اس مخلوق خاکی کو عطا کیا ہے۔[1]

اس خلیفۂ خدا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اسرار، امانت اور مخصوص معاملات کا امین مقرر کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس مفہوم کی طرف واشگاف الفاظ میں اشارہ کرتا ہے کہ:

هو انشاء کم من الارض و استعمر کم فیها

"اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اسی نے تم کو اس میں آباد کیا ہے"

(سورہ ھود ۱۱ آیت ۶۱)

فان تولوا فقد ابلغتکم ما ارسلت به الیکم و یستخلف ربی قوما غیر کم و لا تضرونه شیئا ان ربی علی کل شئی حفیظ

"پھر اگر تم پھر جاؤ تو میں نے تم کو وہ پیغام پہنچا دیا جس کے لئے میں تمہاری طرف بھیجا گیا تھا اور میرا پروردگار تمہارے سوا ایک اور قوم کو تمہارا

---

(۱) خلافت کی دو اقسام ہیں ایک خلافتِ عامہ جس کا اعزاز انسانوں کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے (انی جاعل فی الارض خلیفہ بے شک میں زمین پر خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ سورۃ بقرہ ۲ آیت ۳۱) اور دوسرے خلافتِ خاصہ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت و رہبری کے لئے چند مخصوص افراد کو ایک خاص منصب پر معین فرمایا ہے جو انبیاء و رسل اور ان کے معین کردہ جانشین کی حیثیت سے مذکورہ فرائض انجام دیتے ہیں (**یا داود انا جعلناک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق** "اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے تم لوگوں کے مابین حق کے مطابق فیصلہ کرو"۔ سورۃ ص ۳۸ آیت ۲۶) درحقیقت نظامِ الٰہی کے نفاذ، بیان و تشریح سے اسی خلافتِ خاصہ کا تعلق ہے۔

جانشین کردے گا اور تم اس کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے بے شک میرا پروردگار ہر شے کا محافظ ہے"۔(سورہ ہود۱۱ آیت ۵۷)

انا عرضنا الامانتہ علی السماوات والارض و الجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا"

"بے شک ہم نے اس امانت کو آسمانوں کے اور زمین کے اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا یقیناً انسان بڑا ظالم اور نادان تھا۔"

(سورہ احزاب ۳۳ آیت ۷۲)

إمنوا باللہ ورسولہ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ

"تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور جن چیزوں میں اس نے تم کو جانشین بنایا ہے ان کا ایک حصہ (اس کی راہ میں) خرچ کرو۔"۔(سورہ حدید ۵۷ آیت ۷)

حضور اکرمؐ نے فرمایا!

کلکم راع و کلکم مسوول عن رعیتہ

"تم میں سے ہر ایک نگراں و محافظ ہے اور تم میں سے ہر ایک سے ان لوگوں کی بابت پوچھ گچھ ہوگی جو تمہاری نگرانی اور سرپرستی میں ہوں گے۔" (ریاض الصالحین ص ۱۲۷)

حضرت علیؑ نے فرمایا۔

اتقوا اللہ فی عبادہ وبلادہ فانکم مسئولون حتی عن البقاع والبھائم

"اللہ سے اس کے بندوں اور اس کے شہروں کے بارے میں ڈرتے رہو اس لئے کہ تم سے (ہر چیز کے متعلق) سوال کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ زمینوں اور چوپاؤں کے متعلق بھی۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۵۔ تاریخ طبری ج ۲ ص ۷۰۱)

مذکورہ آیاتِ خلافت اور دیگر آیات و روایاتِ اسلامی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کسی غرض و غایت کی بنا پر اپنا خلیفہ بنایا ہے چنانچہ حتمی طور پر اس نیابت و خلافت کے کچھ تقاضے بھی ہیں جنہیں نہایت جانفشانی سے بجالانا انسان کی ذمہ داری ہے۔

خلافت کے تقاضے

ہم خلافتِ الٰہیہ کے تقاضوں کو یہاں نمبروار بیان کرتے ہیں۔

اول

خلافت الٰہیہ کا ایک تقاضہ یہ ہے کہ انسان زمین کی آباد کاری میں اپنی تمام مساعی و کوشش مبذول کرے یہ کام چاہے مادی و عمرانیات سے مربوط ہو چاہے اجتماعی و اخلاقی معاملات سے۔ مادی و معنوی دونوں لحاظ سے کرہ زمین پر تعمیر و آباد کاری کا کام تمام انسانوں سے بحیثیت مجموعی مطلوب و مقصود ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوا۔

........واستعمرا کم فیھا

"اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اس لئے آباد کیا تا کہ وہ اس کی آباد کاری کرے"۔ (سورہ ہود ۱۱ آیت ۶۱)

دوم

اس اہم ترین فریضہ منصبی کی انجام دہی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو قواعد و ضوابط کے بغیر خود اس کی اپنی صوابدید اور نظریات پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کام کے متعلق وافی ہدایت و ارشاد اور نظام کے واضح خطوط متعین کر دیئے ہیں۔ اور اس نظام کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں نہ صرف اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ انسان موردِ سرزنش و ملامت بھی قرار پاتا ہے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرہ من الخاسرین۔

"اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواستگار ہو گا وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۸۵)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو ظالم و منافق اور کافر سے تعبیر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ مائدہ آیت ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۷)

سوم

انسان پر بحیثیت خلیفہ دو جوانب سے مسئولیت اور ذمہ داری عائد ہوتی ہیں۔

۱:۔ اللہ کی جانب سے جس نے اس کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔

۲:۔ جس پر اس کو خلیفہ بنایا گیا ہے (یعنی زمینِ خدا اور اس پر بسنے والے موجودات کی جانب سے)

انسان کو چاہئے کہ ہر وقت، ہر لحظہ، ہر حرکت، ہر سکون گفت و شنید، کلام و بیان اور زندگی کے ہر لمحہ میں اس ذمہ داری کا احساس کرے کہ اس کے موکل (یعنی اسے خلیفہ بنانے والے) کی طرف سے کسی بھی وقت باز پرس و محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین و اصولوں کا سختی سے پابند رہے چھوٹا ہو یا بڑا، فکری ہو یا عملی، انفرادی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا سلوکی غرض ہر کام میں اللہ کی خوشنودی و رضا کو اوّلیت، مرکزیت اور ترجیح دے اور ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ اس فریضہ منصبی کے سنگین بار کو کس طرح خوش اسلوبی سے اٹھائے۔

ولا تقف مالیس لک بہ علم ان السمع والبصر و الفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

"اور اس بات کے درپے نہ ہوا کرو جس کا تم کو علم نہ ہو۔ بالتحقیق کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کے متعلق جواب طلب کیا جائے گا"۔ (سورہ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۳۶)

وقفوھم انھم مسئولون

"اور ان کو ٹھہرالو کہ ان سے سوالات کئے جائیں گے"۔ (سورہ صافات ۳۷ آیت ۲۴)

دوسری طرف زمینِ خدا اور زمین پر بسنے والوں کے بارے میں جو مسئولیت اور ذمہ داری اس پر عائد کی گئی ہے اسے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ آئین و اصول اور حکم و فرمان کے مطابق پورا کرے۔ یعنی خود اور دوسرے بنی نوع انسان کو کمالِ حقیقی کی منزل تک پہنچانے کی سعی کرے۔

اپنی اصلاح و تعمیرِ ذات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے افراد کی اصلاح و تعمیر بھی لازمی ہے چنانچہ زمین کے ہر خطے کی حفاظت 'نظامِ خداوندی کی عمارت کی تعمیر و آباد کاری اور عدل و انصاف کے پھیلانے اور ظلم و جور و طاغوت و کفر کے آثار و مظاہر کے خاتمے کے سلسلے میں یقیناً سوال و باز پرس ہوگی چنانچہ حضرت علیؑ اسی جانب اشارہ فرماتے ہیں۔

"اللہ سے اس کے بندوں اور اس کے شہروں کے بارے میں ڈرتے رہو۔ اس لئے کہ تم سے ہر چیز کے متعلق سوال کیا جائے گا یہاں تک کہ زمینوں اور چوپاؤں کے متعلق بھی۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۵)

اسلامی وطن کا دفاع خود اسلام کے اصول و تعالیم کے دفاع ہی کی مانند ایک فریضہ ہے۔ پرچم توحید کو سارے جہاں کے گوشے گوشے پر لہرانا خلافتِ الٰہیہ کے تقاضوں کا ایک جز ہے پرچمِ اسلام کی رفعت 'اسلامی نظام کی حکومت 'عدل و انصاف 'استقلال و آزادی' قرآن و احکامِ الٰہیہ کا مکمل طور پر قیام انسان کی مسئولیت و دینی فرائض میں سرفہرست ہے۔ یہ عظیم ذمہ داری اور اہم ترین منصبی فریضہ دعوتِ عمل 'دعوتِ حق اور تبلیغ و فروغِ احکام اور قرآن و نظام الٰہی کی نشرواشاعت کے عمل کے ضمن میں انجام پاسکتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان دعوتِ حق اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے کام سے کنارہ کش ہوجائے' خدا کی حکومت کے قیام کی کوشش سے دست بردار ہوجائے اور روئے زمین پر اصلاح و تعمیر و آباد کاری کے فریضے سے چشم پوشی کرے تو لامحالہ خلافتِ الٰہیہ کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور انسان بھی اس منصب کا مستحق نہیں رہتا اور اپنی تقصیر و کوتاہیوں کی سزا و عتاب کا مستحق قرار پاتا ہے

لہٰذا انسان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دعوتِ حق کے عمل کو آگے بڑھاتا رہے اور ماحول کے مطابق عملی اقدام کے لئے مناسب مواقع کی تلاش میں رہے تاکہ عذابِ الٰہی و قہر خداوندی کی گرفت میں آنے سے قبل اپنے نفس سمیت دوسروں کو بھی بچانے کے اسباب و وسائل فراہم کرسکے۔

چھٹی وجہ ـــــ تمدنی ضرورت

اسلامی عمل، اسلام کی دعوت اور تعلیماتِ قرآن مجید کے فروغ کی ضرورت، دورِ حاضر کے حالات و اوضاع کا مطالعہ کرنے والے ہر فرد پر واضح ہے کیونکہ دنیا پر حکم فرما نظام سیاست جو سرمایہ داری یا مارکس ازم سے عبارت ہے، انسانیت کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام ہوچکا ہے۔ لہٰذا اب انسانیت ایک ایسے نظام کی متلاشی ہے جو اس کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کو برلانے والا ہو اور جس میں اس کے تمام مسائل و مشکلات کا حل موجود ہو۔ ایسا نظامِ مطلوب صرف اسلام ہی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے واضح احکام و قوانین کا حامل ہے اور ان تمام خامیوں، کمزوریوں اور بنیادی نقائص سے پاک و مبرا ہے جو باقی نظاموں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جو اسلام کے مزاج اور اس کے فلسفہ سے آگاہ حضرات کے لئے محتاجِ بیان نہیں۔

یہاں ہم اسلام اور دیگر نظاموں کے مابین تقابلی جائزہ پیش کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہر نظام کے بنیادی فلسفہ، اس کی اساسی تعلیمات اور اس کے مطابقِ فطرت یا مخالفِ فطرت ہونے کی وضاحت اور ان کا آپس میں موازنہ و مقابلہ کریں۔ یہ موضوع ہماری بحث کا حصہ نہیں۔ ہاں طالبانِ حق اس موضوع پر دوسرے علما و دانشوروں کی تالیفات کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔[1]

---

(۱) بالخصوص ان اسلامی مفکرین کی کتب کا مطالعہ نہایت مفید ہے شہید آیت اللہ سید محمد باقر الصدر، علامہ محمد حسین طباطبائی، شہید مرتضیٰ مطہری، شہید سید قطب مصری، محمد قطب مصری، ابوالاعلیٰ مودودی۔

یہاں ہماری مراد صرف یہ باور کرانا ہے کہ گوشہ و کنارِ عالم میں انسانیت پر حکم فرما ہر نظام بنی نوع انسان کی مشکلات اور مسائل کا صحیح حل اور کامیاب علاج پیش کرنے سے نا صرف عاجز و قاصر رہا ہے بلکہ آج عالم انسانیت جس تباہی و بربادی اور جن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہے ان کا حقیقی سبب بھی یہی نظام ہیں۔ اگر ان نظاموں کے نتیجے میں رونما ہونے والے تباہ کن اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بقول " دفتر کے دفتر درکار ہیں"۔

تاہم مشرق و مغرب کے نظاموں سے جنم لینے والے مشترکہ نقائص کی حقیقت کا تذکرہ ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلی حقیقت:۔ موجودہ مشرق و مغرب کے نظاموں میں اخلاقی اقدار اور روحانی تقاضوں کو بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے۔

دوسری حقیقت:۔ دونوں نظاموں میں مادہ پرستی اور مفاد پرستی کا جنون اپنی معراج کو پہنچ چکا ہے۔

تیسری حقیقت:۔ ان کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف اور صرف طاقت میں مضمر ہے جس کے پاس طاقت ہو وہی حق پرست اور حق ہے۔

چوتھی حقیقت:۔ ان نظاموں کو قبول کرنے کی بنا پر ساری انسانیت تباہ کن جنگوں اور انسانیت سوز معرکوں کی جانب بڑی تیزی سے گامزن ہے۔

پانچویں حقیقت:۔ یہ دونوں نظام سیاست، ثقافت، معیشت، تعلیم اور تہذیب و تمدن کے میدانوں میں کمزور اور مظلوم قوموں کا استحصال کررہے ہیں۔ ان کے بنیادی حقوق کو پامال کررہے ہیں اور ان میں عزت و عظمت اور آزادی کے شعور کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم مظلوم اقوام کا دفاع کرنے والے اور انسانی حقوق کے پاسبان ہیں۔ ان کے انسانی حقوق کے نعروں کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ ان کا مقصد قوموں کے اذہان کو مفلوج کرنا اور ان سے سوچ و بچار اور فکر و خیال کی قوتوں کو سلب کرلینا ہے۔

مذکورہ حقائق کی موجودگی میں مشرق و مغرب کے نظام ہائے حیات میں انسانی حیات و زندگی

کا مفہوم عنقا ہو کے رہ جاتا ہے۔ ان کا تہذیب و تمدن اپنے اندر خود اپنی نفی کے اسباب و علل کی پرورش و نشوونما کے ساتھ ساتھ پورے عالم بشریت کو ہلاکت و نابودی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ مشرقی بلاک میں پیدا ہونے والا دھماکہ خیز انقلاب ہمارے اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے کہ اس نظام کے اندر خود اس کی نفی کے اسباب و علل نشوونما پا رہے تھے اور ہلاکت و تباہی کے اسباب و علل اس تیزی سے پھل پھول رہے تھے کہ یہ نظام لمحوں میں فنا کے گھاٹ اتر گیا

بنی نوع انسان نے خود اپنے فکر و خیال کے ساختہ و پرداختہ اجتماعی و سیاسی نظاموں کا خوب تجربہ کیا ہے اور یہ اب اپنے مسائل و مشکلات کے حل اور آئندہ نسلوں کے مستقبل سے مایوس ہو چلا ہے لہٰذا موجودہ حالات سے خائف ہے اس کی حقیقتوں سے فرار چاہتا ہے' روز بروز اسکی ذہنی الجھنیں' نفسیاتی پریشانیاں' فکری تشویش اور اعصابی امراض بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

اس مادی دور نے انسان کے صرف حیوانی اور مادی پہلو کی جانب توجہ دی' اس کے حیوانی پہلو کے تقاضے پورے کئے اور انسان کو صرف ایک جانور کی حیثیت سے دیکھا۔ اس کے لئے زندگی کے زرق و برق وسائل نت نئی شکلوں میں تیار کئے اور ہر روز ان کی نوعیت اور تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے' تاہم یہ نظام اپنی انتہائی ترقی کے باوجود انسان کو اطمینانِ قلب' سکونِ جان' راحتِ خاطر اور پر امید زندگی دینے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ شاید انہی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد کسی شاعر نے یہ شعر کہے۔

ڈیوڑھی نہیں در نہیں کہ درباں نہیں؟
بلبل نہیں نہیں کہ بستاں نہیں؟
ہے جمع جہاں بھر کا ساماں گھر میں
خاطر خاطر جمعی کا کوئی ساماں نہیں

صرف اسلام نجات دہندہ نظام

یہ صرف اسلام ہے جو انسانیت کی ساحلِ نجات تک راہنمائی کر سکتا ہے' اس کے مسائل و مشکلات کا معقول حل اور کامیاب علاج پیش کر سکتا ہے' ناامیدی کے بجائے امید'

قلق و اضطراب کے بدلے اطمینانِ قلب و سکون اور پریشانی و تشویش کی جگہ راحت و فرحت کے سامان فراہم کر سکتا ہے۔

الذین امنوا تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

"جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل ذکرِ خدا سے مطمئن ہیں۔ آگاہ ہو کہ ذکر خدا ہی سے دل مطمئن ہو جایا کرتے ہیں"۔ (سورہ رعد ۱۳ آیت ۲۸)

ولو ان اھل القری امنوا و اتقوا لفتحنا علیھم برکات من السما و الارض۔

"اور اگر بستی والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے"۔ (سورہ اعراف ۷ آیت ۹۶)

وا لو استقاموا علی الطریقتہ لا سقینٰھم ماء غدقا

"اور اگر وہ سیدھے راستے پر قائم رہتے تو ہم ان کو بکثرت پانی سے سیراب کرتے۔" (سورہ جن ۷۲ آیت ۱۶)

وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبد لنھم من بعد خو فھم امنا۔

"ان سب لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ضرور ان کو اسی زمین میں جانشین بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلوں کو جانشین بنایا تھا۔ اور ضرور ان کے دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کر لیا ہے ان کی خاطر اسے پائیدار کر دے گا اور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔" (سورہ نور ۲۴ آیت ۵۵)

یہ اسلامی نظام کی خصوصیت ہے کہ مشرق و مغرب کے نظاموں میں پائی جانے والی کمزوریوں، خامیوں اور نقائص سے پاک و مبرا ہے اور اپنے اندر زندہ اصول، متحرک قواعد اور جاندار قانون اس انداز سے سمیٹے ہوئے ہے کہ ہر دور میں ساری انسانیت کے مسائل و مشکلات کا درست حل اور مجرب علاج پیش کرنے کی پوری پوری صلاحیت و اہلیت کا حامل

ہے۔

مذکورہ گذارشات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ اسلام کی تبلیغ اور دعوت اس دور کی تہذیبی اور تمدنی ضرورت ہے تاکہ اسلام کے نظامِ عدل کی روشنی میں اور عالمی اسلامی حکومت کے سائے میں ظلم وستم کی چکی میں پسا ہوا انسان اطمینان وسکون کا سانس لے سکے' زندگی کی حقیقی لذتوں اور روحانی مسرتوں سے آشنا ہوسکے' اس کی زندگی کے مادی اور معنوی تقاضے یکساں طور پر پورے ہوسکیں' اخلاقی و روحانی اقدار کی حکمرانی' مادہ پرستی کے بدلے خدا پرستی' حق وباطل کے معیاروں کی تمیز' خدمتِ خلق اور بالخصوص مظلوم قوموں کے حقوق کی نگہداشت اس نظام کا اولین نصب العین ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام کے نفاذ کی دعوت اور قرآن کی تعلیمات کی تبلیغ وترویج کا کام مسلسل جاری رہنا چاہئے اور یہ فریضہ ہر ذی شعور فرد اور گروہ کے ذمہ پر عائد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سلسلہ میں ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

دعوتِ اسلامی سنت انبیاء سیرتِ اولیاء

اسلامی دعوت کے سب سے پہلے علم بردار انبیاءِ الٰہی تھے' حضرت آدم علیہ اسلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاؐ تک یہ سلسلہ اسی مقصد کے لئے جاری رہا کہ خداوندِ کریم کے احکام اور دینِ مقدسِ الٰہی کا حیات آفریں اور زندگی بخش پیام ہر وقت اور ہر دور میں ہر انسان تک پہنچتا رہے۔ چنانچہ ہر نبی و رسول کے بعد اس سلسلہ تبلیغ کو آگے بڑھانے کا کام ان کے جانشینوں' اوصیاء و خلفائے برحق کے توسط سے انجام پاتا رہا۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دینِ مبینِ اسلام قیامت تک باقی رہے گا اور اس میں کسی تنسیخ و تعلیق کی ذرہ بھر گنجائش نہیں۔ لہٰذا انبیاء الٰہی اور اولیائے کرام کی سیرت وسنتِ مطہرہ پر عمل کرتے ہوئے تبلیغی کام اور دعوتی عمل کا ذمہ دورِ حاضر کے باشعور' بافہم اور صاحبِ ادراک انسانوں کو اٹھانا ہے۔ یہی شرعی ذمہ داری ہے اور اسی میں انسانیت کی فلاح مضمر ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوہ حسنۃ۔

"بے شک تمہارے لئے پیروی کرنے کو اچھے سے اچھا نمونہ خود رسول اللہ

میں موجود ہے"۔(سورہ احزاب ۳۳ آیت ۲۱)

قد کانت لکم اسوہ حسنتہ فی ابراہیم والذین معہ۔

"بے شک تمہارے لئے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو ان کے ساتھ تھے اچھا نمونہ موجود ہے"۔(سورہ ممتحنہ ۶۰ آیت ۴)

وانہ لذکر لک ولقومک وسوف تسئلون۔

"اور یہ قرآن ضرور تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے ذکر (یاد دہانی کرانے والا) ہے اور تم سے سوال کیا جائے گا۔" (سورۂ زخرف ۴۳ آیت ۴۴)

قرآن کریم ہدایت یافتگان کی سنت و سیرت پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے رہا ہے اور دعوت الی اللہ ان کی سنت و سیرت کا ناقابلِ جدائی جز ہے۔

اولئک الذین ھدی اللہ فبھدا ھم اقتدہ۔

"وہ وہی تو ہیں جن کو اللہ نے خاص طور پر ہدایت کی ہے۔ پس اے رسول! تم ان ہی کے راستے پر چلو"۔(سورہ انعام ۶ آیت ۹۰)

چناچہ حضرت امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ انبیاء کے بعد تبلیغی ادوار کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دعوتِ دین اور تبلیغِ پیام الٰہی کا سنگین عمل ان کے بعد خود بنی نوع انسان کے واسطے قائم و دائم رہے گا۔

وما یبلغ عن اللہ بعد رسل السماء الا البشر۔

"آسمانی رسولوں کے بعد بشر ہی ہوتے ہیں جو تم تک اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۲۰)

دعوتِ اسلامی کی ضرورت کے بارے میں ایک مردِ مومن باعمل شخص کے لئے صرف یہی بات کافی ہے کہ اس میں اتباعِ انبیاء اور سنت و سیرتِ اولیاء پر عمل پیرا ہونے کا شرف مضمر ہے۔

کیونکہ منکرینِ حق و حقیقت انبیاء الٰہی اور داعیانِ اسلام کے درمیان کوئی فرق محسوس

نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کے مشن کو انبیاء کا مشن' ان کے راستے کو انبیاء کا راستہ اور ان کے اہداف ومقاصد کو انبیاء کا مقصد وہدف گردانتے ہوئے مقابلہ کے میدان میں وارد ہوتے ہیں اور انہیں مصائب و مشکلات اور قتل وغارت سے دوچار کردیتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم اس بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے۔

ان الذین یکفرون بایات اللہ ویقتلون النبین بغیر حق ویقتلون الذین یامرون بالقسط من الناس فبشرھم بعذاب الیم۔

"بہ تحقیق جو لوگ خدا کی نشانیوں کے منکر ہیں اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں کو عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں پس ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۲۱)

داعی کا مقام

اس باب کے آخر میں داعیانِ اسلامی کے لئے یہ تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ وہ اپنے مشن اور اسلامی پیام کی ترویج کے فریضے کی بنا پر عنداللہ کس مقام و منزلت کے حامل ہیں اور اس مہم کی نوعیت کیا ہے جس کی انجام دہی کے لئے وہ تن' من' دھن سے مصروف عمل ہیں۔

مبلغ کے لئے اس بات کا ادراک از بس ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو روحانی زندگی عطا کررہا ہے اور انسانی نشاۃ ثانیہ کے سنگین اور بے مثل عمل کو انجام دے رہا ہے۔ لہٰذا اس کا مقام و مرتبہ اس اعلیٰ مقصد اور بلند ہدف کے پیشِ نظر نہایت ارفع وبالا ہے۔ کیونکہ دنیا میں انجام دیئے جانے والے دوسرے تمام اعمال وافعال اور فرائض میں فریضہ تبلیغ کا کوئی ہمتا اور ہم مثل نہیں۔ چنانچہ لوگوں کی ہدایت وارشاد اور افرادِ معاشرہ کی اصلاح کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ اسلامی نصوص کا محض سرسری مطالعہ کرنے ہی سے ہوجاتا ہے۔

ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا۔

"اور جس نے ایک نفس کو زندہ کردیا تو گویا اس نے کُل آدمیوں کو زندہ کردیا۔" (سورہ مائدہ ۵ آیت ۳۲)

اگر انسان کے مادی وجود اور اس کے جسم و جان کو ہلاکت سے بچانا' اسے زندگی عطا کرنا یا اس کی حفاظت کرنا پوری انسانیت کو حیات عطا کرنے کے مترادف ہے تو اس کی روحانی زندگی' ابدی نجات اور حقیقی حیات کے اسباب وسامان فراہم کرنا کس قدر اہمیت کا حامل ہوگا اور یوں یقیناً انسان کو روحانی زندگی کے اسباب فراہم کرنے والے کا مقام و مرتبہ اس شخص سے بدرجہا افضل و برتر ہوگا جو اس کی مادی و جسمانی زندگی کی بقا و سلامتی کے وسائل فراہم کرے۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت کی تشریح و تفسیر میں آیا ہے کہ "کسی کو دریا میں غرق ہونے یا خشکی میں موت سے نجات دلانا احیاء کا ظاہری معنی و مفہوم ہے"۔ اس کی گہری اور دقیق تفسیر یہ ہے کہ اس کو کفر سے ایمان' گمراہی سے ہدایت اور کج روی و انحراف سے صراطِ مستقیم پر لانا ایک عظیم کام اور افضل عمل ہے۔ (تفسیر المیزان جلد ۵ صفحہ ۳۲۳ بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۲۰ اور ۲۱)

آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو داعیٔ اسلام اور مبلغِ پیامِ الٰہی بنا کر یمن بھیجتے وقت فرمایا تھا "اے علیؑ! اگر تیرے ہاتھوں ایک شخص بھی ہدایت پا جائے تو ساری کائنات سے افضل و بہتر ہے"۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۳۰۔ فروع کافی جلد ۵ صفحہ ۳۶)

امام حسن عسکریؑ اپنے آبائے کرام کے توسط سے آنحضرت سے یہ روایت کرتے ہیں کہ:

"جو شخص ہمارے اس شیعہ کی جو دین و شریعت سے دور ہو ہدایت و ارشاد کرے وہ فردوسِ اعلیٰ میں ہمارے ساتھ ہوگا"۔ (المحجۃ البیضاج ۱ ص ۲۹)

امر بالمعروف و نہی از منکر کے عامل' داعیٔ اسلام' پیامِ خداوندی کے مبلغ اور فرد و معاشرہ کی اصلاح کے لئے سرگرمِ عمل مردِ مومن کی منزلت و مقام کے اندازے کے لئے صرف اس حقیقت کی جانب توجہ ہی کافی ہے کہ یہ جس فریضہ کی انجام دہی کے لئے کوشاں ہے وہ انبیاء الٰہی کا فریضہ ہے اور اسی فریضہ کی بنا پر انبیاء تمام انسانوں سے افضل و اشرف ہیں۔

☆——☆——☆

باب دوم

عمل نہ کرنے کے بہانے

بابِ اول میں ہم نے اسلامی عمل کی اہمیت اور عصرِ حاضر میں اس کی ضرورت کے موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہاں بابِ دوم میں ہم ان حیلے بہانوں اور شکوک و شبہات پر گفتگو کریں گے جن کو بنیاد بنا کر کچھ افراد اسلامی عمل کی انجام دہی سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

گو کہ گزشتہ باب میں بیان کئے گئے دلائل کے بعد عمل سے روگردانی کا کوئی شرعی جواز باقی نہیں رہتا۔ مگر پھر بھی ہم نے اس لئے بابِ دوم کا اضافہ کیا ہے تاکہ اسلامی عمل کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں معمولی سا شک و شبہ بھی باقی نہ رہے اور اس میدانِ کارزار سے فرار کرنے والوں کے پاس کوئی دلیل اور کوئی بہانہ باقی نہ بچے۔

اسلامی عمل سے گریز کی جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں اور جو بہانے پیش کئے جاتے ہیں، تجزیہ و تحلیل کے بعد مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں ان کا خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱ ——— عصرِ حاضر میں اسلامی عمل کی انجام دہی کے لئے ہمارے پاس کوئی محکم اور پُر یقین شرعی جواز نہیں۔

۲ ——— جوازِ شرعی تو ثابت ہے مگر اس فریضہ کی انجام دہی کی ذمہ داری ایک

خاص گروہ (علماء) پر عائد ہوتی ہے۔

۳ ـــــــ ہم عصرِ حاضر میں اسلامی عمل کی انجام دہی سے عاجز و ناتواں ہیں کیونکہ آج اسلام دشمن قوتیں نہایت مستحکم اور بہت قوی ہیں اور ان سے مقابلہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

۴ ـــــــ اسلامی عمل کی انجام دہی سے نہ تو کوئی فائدہ ہے اور نہ مادی حیثیت سے کامیابی ہی کی کوئی راہ نظر آتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک فرد یا چند افراد کا عمل کہاں تک مفید ثابت ہو گا؟

جبکہ صورتحال یہ ہے کہ معاشرہ فساد و تباہی، اخلاقی زبوں حالی اور صراطِ مستقیم سے انحراف کے سیلاب میں غرق ہو چکا ہے۔

۵ ـــــــ اسلامی عمل کی انجام دہی میں دنیاداری اور شہرت طلبی وغیرہ کا عنصر غالب آسکتا ہے جو کہ اخلاصِ عمل اور زہد و تقویٰ کے منافی ہے اس کے برعکس گوشہ نشینی میں زہد و تقویٰ کا لباس سلامت رہتا ہے اس لئے اجتماعی میدان میں نکل کر کام کرنا مناسب نہیں۔

۶ ـــــــ اسلامی عمل کا کام مسلسل محنت طلب، کٹھن مراحل اور صعوبتوں سے پر ہے لہٰذا ایسے افراد جو دنیاوی زندگی کی لذتوں اور مادی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہوں وہ اس پُر مشقت عمل اور مشکل فریضہ کو انجام دینے پر آمادہ نہیں۔

۷ ـــــــ گھریلو مسائل اور عائلی مصروفیات بھی اس فریضہ کی انجام دہی میں رکاوٹ تصور کی جاتی ہیں۔

پہلی وجہ کی تفصیل اور اس کا جواب

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ عصرِ حاضر میں اسلامی تعلیمات ہم سے کسی اصلاحی عمل کی انجام دہی کا تقاضہ نہیں کرتیں یا اس سے بھی بڑھ کر کہتے ہیں کہ ایسا کوئی عمل جائز ہی نہیں اِس دور میں ہم سے صرف ایک ہی فریضہ کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے اور وہ ہے "امام زمانہؑ کی

تشریف آوری کا انتظار کرتے رہنا" اور قانونِ تقیہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے اسلامی فرائض انجام دیتے رہنا۔ لہٰذا ان مذکورہ دو نظریات (مفہومِ انتظار اور قانون تقیہ) کے برخلاف ـــ اقدامات کرنا ناجائز اور اسلامی تعلیمات کے معین کردہ اصولِ عمل کی سراسر خلاف ورزی ہے"۔

نظریۂ ظہورِ مہدیؑ

اس عنوان کے تحت ہم مندرجہ ذیل دو گرہوں کے نظریات و خیالات پر روشنی ڈالتے ہوئے نظریۂ ظہور مہدیؑ کی تکذیب اور اس پر تعجب کرنے والوں اور انتظارِ مہدیؑ کے مفہوم کو غلط رنگ دینے والوں کے خیالات و نظریات پر بحث کریں گے۔

(۱) نظریۂ مہدیؑ کے منکرین

(۲) نظریۂ مہدیؑ کے قائلین

نظریۂ مہدیؑ کے منکرین

اس گروہ کے نظریہ کا متعدد افراد نے اپنے اپنے انداز سے اظہار کیا ہے ہم یہاں ان میں سے ایک جناب جنرل اکبر خان کے خیالات کو موردِ تحقیق قرار دیتے ہیں آپ ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"دجال اور امام مہدیؑ کا کوئی وجود نہیں، نہ دجال آئے گا اور نہ مہدیؑ یہ محض یہودی شرارت ہے جس کا مطلب صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو توہمات اور خوش فہمیوں میں مبتلا کرکے ان کے جذبۂ جہاد کو مفلوج کردیا جائے۔

........ابن خلدون راوی ہے کہ حضرت امام حسن عسکریؑ کا بیٹا جس کی عمر تقریباً پانچ برس تھی کھیلتے کھیلتے ایک غار میں چلا گیا پھر اس بچے کا کوئی سرغ نہ ملا۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ ایک افواہ اٹھی کہ مہدیؑ کو غیبی قوت نے غائب کردیا ہے اور وہ اب قوم کا نجات دہندہ بن کر غار سے نکلے گا چنانچہ لوگ ہر سال اس غار کے سامنے جمع ہو کر امام مہدیؑ کا انتظار کرنے لگے اور آج تک انتظار کر رہے ہیں۔

مسلمانوں نے اپنے ہادیؑ برحقؐ کے فرمان کو فراموش کر کے خیالی مہدیؑ اختراع کر لئے"۔
(سیارہ ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۶۸ء بہ عنوان "عرب اسرائیل جنگ")۔

جنرل کو جواب

فی الحال ہمارا مقصد نظریہ ظہور مہدیؑ کی نفی یا اثبات پر بحث کرنا نہیں اور یوں بھی یہ موضوع ہماری کتاب سے باہر ہے مگر جنرل صاحب کے مقالے سے متعلق چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔

پہلا جواب

کیا ہی اچھا ہوتا اگر جنرل صاحب اپنے میدان تخصص ہی میں رہتے ہوئے کوئی کتاب یا مقالہ تحریر فرماتے اور عسکری زاویۂ نگاہ سے عرب اسرائیل جنگ کا جائزہ لیتے اور نظریۂ امام مہدیؑ جیسے معرکۃ الآرا اور خالص علمی موضوع پر اظہارِ خیال کی زحمت نہ فرماتے۔

دوسرا جواب

ابن خلدون نے کسی عقلی یا نقلی اور تاریخی دلیل کے بغیر امام مہدیؑ کا انکار کیا ہے جبکہ دوسرے معروف اور جید علماء کرام نظریۂ امام مہدیؑ کے اثبات میں ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور علامہ ابن حجر ہیثمی نے یہاں تک فتوی دیا ہے کہ۔

من انکر المهدی المنتظر فهو کافر

"جو امام مہدیؑ منتظر کا انکار کرے وہ کافر ہے"۔(صواعق المحرقہ ص ۱۸۱)

لہٰذا ابن خلدون کے انکار کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔

تیسرا جواب

غار اور اس پر لوگوں کے ہر سال انتظار کا جو تذکرہ ہے وہ صرف ایک افسانہ ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا جنرل صاحب کے کلام میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کہ یہ غار کہاں ہے؟ یہ لوگ کون ہیں؟

چوتھا جواب

اب ہم جنرل صاحب کے کلام کے اس نکتہ پر گفتگو کرتے ہیں جس کا براہ راست تعلق ہمارے موضوعِ بحث سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

"نہ دجال آئے گا اور نہ امام مہدیؑ۔ یہ محض یہودی شرارت ہے جس کا مقصد محض یہ تھا کہ مسلمانوں کو توہمات اور خوش فہمیوں میں مبتلا کر کے ان کے جذبہ جہاد کو مفلوج کر دیا جائے"۔

اس کا مقصد یہ ہوا کہ نظریہ مہدیؑ منتظر نے مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے فریضہ کی انجام دہی سے باز رکھا اور ان میں اصلاحِ معاشرہ اور ہر قسم کے دفاعی عمل کے جذبہ کو ختم کر دیا دشمنانِ اسلام بھی یہی چاہتے تھے اور یوں وہ اپنے مقصد و خواہش میں کامیاب ہوئے۔ اب مسلم معاشرہ میں فعالیت اور حرکتِ عمل اسی صورت میں پیدا کی جاسکتی ہے کہ جب اس میں محرکِ حرکت و عمل دوبارہ زندہ کیا جائے اور یہ کام اسی وقت ممکن ہے جب نظریہ مہدیؑ منتظر سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور اس عقیدہ پر ایمان رکھتے ہوئے کسی مثبت اقدام کی توقع رکھنا غیر معقول آرزو ہے۔

یہاں ہم جنرل صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ اگر ظہور امام مہدیؑ کا عقیدہ ایک عام عقیدہ ہے اور تمام مسلمان اس کے معترف ہیں تو اسے یہودی شرارت اور خیالی مہدی سے تعبیر کرنا مسلمانوں کی توہین نہیں تو پھر کیا ہے۔ آپ مسلمانوں کے ایک پیچیدہ مسئلہ کا حل پیش کرنے کے بجائے اس کی توہین و تنقیص اور مذاق اڑا رہے ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک ایسا عقیدہ جس کا قرآن و سنت میں کوئی ذکر نہ ہو یہودیوں اور اسلام دشمن عناصر کی کوششوں سے سارے مسلمانوں میں مستحکم ہو اور پھیل جائے؟

اگر عقیدہ امام مہدیؑ صرف ایک فرقے سے مخصوص ہو تو اس کے منفی اثرات (جذبہ جہاد کا فقدان) بھی محض اسی فرقے تک محدود رہنا چاہئے۔ اس مقام پر یہ سوال بجا ہے کہ ان مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو کس نے مفلوج کیا جو اس نظریہ کے منکر ہیں؟ خود جنرل صاحب کا شمار بھی اس عقیدے کے منکرین میں ہوتا ہے۔

جنرل صاحب اور ان کے ہم خیال و ہم عقیدہ حضرات نے مسلمانوں کی بیداری، مسلم معاشرہ کی اصلاح، اسلامی نظام کی حکمرانی اور ظلم و ستم و بے انصافیوں و ناہمواریوں سے مقابلے کے لئے اب تک کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں؟ جذبہ جہاد، شوقِ عمل اور ضرورتِ اصلاح کی حس کا کیا ثبوت دیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ نظریۂ مہدیؑ منتظر کے قائلین نے حرکت، انقلاب، قیام و جہاد اصلاحِ معاشرہ اور تبدیلیٔ نظام کا ثبوت کچھ اس انداز سے دیا ہے جس کی عصری تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی وہ اس جاہلیت سے پر مادی دور میں خالص اسلامی اصولوں پر مبنی اسلامی حکومت کے قیام میں کامیاب ہوئے اور عالمی کفر اور دنیا کی سپر طاقتوں کے خلاف ہر سطح پر اعلانِ جہاد کر چکے ہیں نیز اپنی بساط و قدرت کے مطابق ہر اندرونی اور بیرونی انحراف سے نبرد آزما ہیں اس معجزانہ انقلاب اور عظیم کارنامے کا سہرا حضرت امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ کہ جو مطیع و عاشق امام زمانؑ تھے کے سر پر ہے۔

بنا بریں بخوبی معلوم ہوا کہ نظریۂ مہدیؑ منتظر مسلمانوں میں ترقی اور جہاد کے جذبہ کو مفلوج نہیں کرتا بلکہ یہ ایک الزام اور بہانہ ہے جس کے ذریعہ جنرل صاحب اور ان کے ہم خیال اپنی ذمہ داریوں سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی اور سستی کا اس نظریہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ نظریۂ انتظار مسلمانوں کو شدت سے دعوت دیتا ہے کہ موجودہ حالات کا نہ صرف مقابلہ کریں بلکہ اس صورتحال کے اسباب و محرکات تک کا قلع قمع کردیں۔

نظریۂ مہدیؑ کے قائلین

نظریۂ امام زمانہؑ کے کچھ قائلین کا یہ خیال ہے کہ "دورِ غیبت کبریٰ میں ہم سے کسی قسم کا اصلاحی عمل اور انقلابی کام مطلوب نہیں کیونکہ یہ عظیم کام خود مصلحِ عالم مہدیٔ موعود حضرت ولیٔ عصرؑ کے بنیادی فرائض میں شمار ہوتا ہے اور معاشرہ سازی، اسلامی حکومت کا قیام، نظامِ حدود و تعزیرات کا اجراء ان کی ذات گرامی سے مخصوص ہے۔ جب بھی امام زمانہؑ کا ظہور ہوگا اور وہ حضرتؑ پردۂ غیب سے منصۂ شہود پر تشریف لائیں گے تو اسلامی عمل اور

اصلاحی اقدام خود بخود عمل میں آئے گا لہٰذا ان کے ظہور سے قبل مذکورہ بالا فرائض کی انجام دہی کا کوئی شرعی جواز نہیں یا کم از کم شرعی جواز کا پایا جانا مشکوک ضرور ہے لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم صرف امامِ زمانہؑ کے منتظر رہیں اور صبح شام آپ کی تشریف آوری کے لئے دعا کرتے رہیں۔ البتہ کچھ ایسے امور کی انجام دہی میں کوئی حرج نہیں جن کے بغیر معاشرہ اور فرد کی زندگی میں افراتفری اور حرج و مرج کا امکان ہو"۔

اس فضول خیال کا جواب

اس خیال کا باطل ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس سلسلہ میں زورِ قلم صرف کرنا وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں تاہم مسئلہ کی وضاحت کے لئے چند نکات بطورِ جواب ہدیہ قارئین ہیں۔

مذکورہ خیال کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظام صرف ایک خاص مدت کے لئے نازل ہوا ہے اور اس خاص مدت کے بعد وہ منسوخ ہو گیا زمانہ غیبت کبریٰ میں اس نظام کو معطل کر دیا گیا ہے اور حضرت امام مہدیؑ بعد از ظہور اسے بحال کریں گے۔

اس قول کا لازمہ یہ ہے کہ غیبت امام عصرؑ میں مسلمانوں سے بالخصوص اور دوسرے لوگوں سے بالعموم شریعت کی جانب سے عائد کی گئی اجتماعی ذمہ داریاں ساقط ہیں اور ان پر اصلاحِ معاشرہ، انسدادِ فساد اور اجتماعی و سیاسی امور سے متعلق کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کوئی بھی مسلمان مذکورہ بالا نظریہ اور اس کے نتیجہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے قوانین و ضوابط رہتی دنیا تک کے لئے ہیں اور ان میں منسوخی یا تعطل کی کوئی گنجائش نہیں اور ہر فردِ مسلمان زمانہ غیبت میں بھی اسی طرح فرائض کی پابندی پر مامور ہے جس طرح وہ عصرِ ظہور میں اسلامی اصولوں کی پابندی کا ذمہ دار تھا۔

علاوہ بریں انتظارِ امامِ زمانہؑ سے متعلق نصوص و روایات میں اس بات کی کافی وضاحت پائی جاتی ہے کہ انتظار کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر منتظر (انتظار کرنے والا) شخص معاشرہ سازی،

اصلاحِ نفوس اور جہاد فی سبیل اللہ کا پابند رہے اور امر بالمعروف اور نہی از منکر کے دو اہم فریضوں پر کاربند رہے تاکہ امامِ زمانہؑ کے ظہور کے لئے ماحول سازگار بنایا جاسکے۔

امام زمانہؑ کا ظہور اصلاحی عمل اور اسلامی ریاست کا قیام کسی معجزانہ اور غیر فطری طریقہ سے نہ ہوگا بلکہ یہ سارا عمل طبیعی طریقوں سے انجام پائے گا۔ چنانچہ امامِ زمانہؑ افرادی قوت (لشکر و مسلح افواج) پردہ غیب سے لے کر نمودار نہیں ہوں گے بلکہ ان کے مشن کی ضرورت کے مطابق مسلح افواج ان کے ظہور سے قبل اس کرہ ارض پر تیار ہو چکی ہوگی اور اقوامِ عالم بھی ذہنی طور پر ایک نئے نظام اور نجات دہندہ کے استقبال کے لئے تیار ہو چکی ہوں گی۔ لہٰذا جب امام زمانہؑ بحیثیت قائد ظہور فرمائیں گے تو انسانی زندگی میں فکری، سیاسی اور اقتصادی سطح پر مکمل اور ہمہ گیر تبدیلی رونما ہوگی اور کرہ زمین پر قرآنی نظام کی حکومت قائم ہوگی۔[1]

نظریہ انتظار اور تصورِ مہدیؑ میں مندرجہ ذیل خصوصیات موجود ہیں۔

(۱) یہ نظریہ درخشندہ مستقبل اور حکومتِ الٰہیہ کے مکمل ظہور و غلبہ کی نوید دیتا ہے۔

(۲) یہ نظریہ داعیان اسلامی اور مبلغان حق و حقیقت کی کوششوں و مساعی کے بار آور ہونے کا واحد راستہ نظر آتا ہے۔

(۳) یہ نظریہ ہر وقت، ہر زمانے اور ہر حالت میں ہر مسلمان کو متحرک و فعال رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

(۴) یہ نظریہ خود سازی، معاشرہ سازی، اصلاحِ فکر اور تبدیلیٔ اعمال کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے اور فریضۂ امر بالمعروف و نہی از منکر پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت بیان کرتا ہے۔

(۵) یہ نظریہ مسلمانوں کو اپنے امامِ زمانہؑ کی قیادت میں ظلم و ستم، عالمی کفر اور تمام انحرافی مسلکوں سے مقابلہ اور ان سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت و استعداد پیدا کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

(۶) یہ نظریہ محروم و مظلوم اور استبدادی طاقتوں کی چکی میں پسی ہوئی انسانیت کی نجات اور

---

(۱) مفہومِ انتظار کے بارے میں ہماری ایک کتاب زیرِ تالیف ہے انشاء اللہ عنقریب ہدیہ قارئین کی جائے گی۔

پائمال شدہ انسانی حقوق ' اخلاقی اقدار اور شرافت و عزتِ نفس کی بحالی کا آخری ذریعہ ہے۔

فلسفۂ انتظارِ مہدیؑ ایسا واضح اور روشن مفہوم ہے جس سے متعلق روایات کے سرسری مطالعہ ہی سے مذکورہ بالا نکات ذہن میں نقش ہوجاتے ہیں۔ یہ نظریہ نہ ہی انسان میں جذبہ جہاد اور شوقِ عمل کے جذبہ کو سرد کرتا ہے اور نہ اس کو غیرذمہ دار اور ساقط التکلیف مخلوق گردانتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی پسماندگی اور زبوں حالی کا نہ اس نظریہ پر اعتقاد سبب ہے اور نہ ہی یہ سبب قرار پاسکتا ہے۔ یہ خود ہمارا قصور ہے کہ اس نظریہ کے فلسفے، مثبت نتائج اور تعمیری پہلوؤں کے ادراک سے عاجز رہے یا پھر ہم مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی اور پسماندگی کے علاج کے حوالہ سے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے قصداً اس نظریہ کو غلط رنگ دے کر پیش کررہے ہیں۔

تقیہ کا مفہوم

کچھ لوگ اصلاحِ معاشرہ اور منکرات و مفسدات کی روک تھام کی غرض سے میدانِ عمل میں قدم رکھنے سے انکار کرتے ہوئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ دور تقیہ کا دور ہے اور کیونکہ اس غرض سے میدان عمل میں کود پڑنے سے جان و مال اور عزت و مقام کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اس لئے قانونِ تقیہ کی رو سے یہ عمل مناسب نہیں۔ پھر یہ کہ دین کی حاکمیت اور اسلامی حکومت کی تشکیل ہماری ذمہ داری نہیں اور اس سلسلہ میں کوئی واضح شرعی جواز بھی موجود نہیں ہے بلکہ یہ عمل موجودہ حالات میں تقیہ کے منافی ہے اور تقیہ کے منافی کوئی اقدام خلافِ اسلام یا کم از کم ضعیف الایمانی کے مرادف ہے۔ چنانچہ ایک روایت ہے کہ

لا دین لمن لا تقیہ لہ

جو تقیہ نہ کرے اس کا دین ہی نہیں۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۰)

لا ایمان لمن لا تقیہ لہ

جو تقیہ نہ کرے اس کا ایمان بھی نہیں۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۰)

ان روایات سے ظاہر ہے کہ تقیہ کے خلاف عمل نہ صرف مستحسن عمل اور اسلام کی

خدمت شمار نہیں ہوتا بلکہ اسلام سے عدم وابستگی کی علامت ہے۔

تقیہ کے مفہوم کی وضاحت

تقیہ کے معنی ہر حالت میں سکون و خاموشی اختیار کئے رکھنا ظلم و تعدی کے سامنے سر تسلیم خم کئے رکھنا' بدعتوں اور گناہوں کے مقابل لاتعلقی کا موقف اپنانا اور نسلوں کی بربادی کے وقت محض تماشائی بنے رہنا ہرگز نہیں۔ نیز تقیہ کا مقصد اس کے عامل کے جذبہ عمل و حرکت کو مفلوج کرنا بھی نہیں اور نہ ہی اس سے قطعاً یہ مراد ہے کہ مسلمانوں میں اصلاحِ معاشرہ اور جوابدہی کے احساس کی روح کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

چنانچہ اسلامی متون و روایات کی روشنی میں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ تقیہ اسلامی اصول و قواعد میں ایک ثابت اور غیر متغیر قانون نہیں کہ ہر حالت اور ہر دور میں جس پر عمل کرنا واجب قرار دیا گیا ہو بلکہ تقیہ داعیانِ حق کے لئے ایک اسلوبِ عمل اور طریقہ کار ہے جو چند مخصوص سیاسی و اجتماعی حالات کے پیش نظر وضع کیا گیا ہے۔ اور ان نامساعد حالات کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ تقیہ پر عمل کا فرض بھی ساقط ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر مذکورہ حالات کا مکمل طور پر خاتمہ نہ ہوا ہو تو اس کی ضرورت میں کمی آتی جاتی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی شخص تقیہ کا بے جا فائدہ اٹھا کر کوئی مثبت اقدام نہ کرے تو اس کا یہ عمل تقویٰ و دیانت داری کے خلاف تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن تقیہ کسی صورت نہیں۔

اپنے مدعا کی مزید وضاحت کے لئے ہم تقیہ سے متعلق ان روایات کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں تقیہ کرنے کا جواز اور بعض خاص حالات اور مواقع و ضروریات کی مناسبت سے اس کا واجب ہونا بتایا گیا ہے اور اس سے یہ حقیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مذکورہ مواقع اور ضروریات اگر موجود نہ ہوں تو تقیہ کا جواز بھی ختم ہو جاتا ہے۔

آیت قرآن ہے۔

الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان

"سوائے اس صورت کے کہ اس پر جبر کیا گیا ہو حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو"۔ (سورہ نحل ۱۶ آیت نمبر ۱۰۶)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

التقیہ فی کل ضرورۃ وصا جھا اعلم بھا حین تنزل بہ

"تقیہ ہر ضرورت کے وقت ہے اور یہ ضرورت اس سے دوچار ہونے والا ہی سب سے بہتر جانتا ہے"۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۸)

امام محمد باقرؑ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

التقیہ فی کل شئی لضطر الیہ ابن ادم فقداحلہ اللہ لہ

"تقیہ ہر اس چیز میں جائز ہے جس کے کرنے پر ابن آدم مجبور ہو"

(وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۸)

ایک اور مقام پر امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ۔

التقیہ فی کل ضرورۃ

"ہر ضرورت کے وقت تقیہ کرنا ضروری ہے"۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۹۔۴۷۰)

مذکورہ بالا روایات اور ان ہی کی مانند دوسری روایات سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ تقیہ اسلامی عمل' تبلیغ و حفاظتِ دین اور اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک طریقہ کار ہے نہ کہ ایک ثابت و دائم اصل قانون۔

دوسرے لفظوں میں اگر حکومت و زمامِ اقتدار اہل اور حقیقی نمائندگانِ الٰہی کے ہاتھوں میں نہ ہو اور حکومت مخالف خیالات و نظریات رکھنے والوں کو آزاد فضا میسر نہ ہو اور وہ اپنے افکار و نظریات کا برملا اظہار نہ کر سکیں ـــــ حکومت کے کارندوں کی جانب سے مخالفین پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہو' ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی کوئی ضمانت نہ ہو پھر یہ کہ اس گھٹن کے ماحول میں ایک یا چند افراد کے اقدام سے معاشرہ میں کسی خاطر خواہ اصلاح اور حالات میں کسی تبدیلی کی امید بھی نہ ہو۔ تو ایسی صورتحال میں عقلِ سلیم اور شرع مقدس دونوں کا اٹل فیصلہ ہے کہ مناسب موقع اور بہتر حالات کا انتظار کیا جائے۔ غیر موثر اقدامات سے بہتر ہے کہ بہتر اور موثر اقدام کے لئے ماحول کو سازگار کیا جائے اور تقیہ کے اس عرصہ

میں خود سازی، معاشرہ سازی، اور ہمہ گیر جہاد کے لئے تمام قوتوں کی فراہمی کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں اس عمل کو جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

والمومن مجاهدلانه يجا هد اعدا الله عز و جل فی دولة الباطل با تقيه

وفی دولة الحق بالسيف۔

"مومن مجاہد ہے اس لئے کہ وہ دشمنان خدا سے حکومت باطل میں تقیہ کے ذریعہ اور حکومت حق میں تلوار کے ذریعہ جہاد کرتا ہے"۔

(وسائل جلد ۱۱ ص ۴۶۴ حدیث نمبر ۱۹ باب ۲۴)

تقیہ ذریعۂ جہاد

مذکورہ روایت کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر مردِ مومن علانیہ کام کرنے سے معذور ہو تو تقیہ (زیر زمین کام) کا اسلوب اپناتا ہے اور اس کو ذریعۂ عمل قرار دے کر جہاد کے انواع و اقسام کی انجام دہی میں مشغول ہوجاتا ہے ہر سطح پر تبلیغِ دین اور معارفِ اسلامی کی نشرو اشاعت کا سنگین فریضہ انجام دیتا ہے اور حکومتِ باطل میں مومن کے انہی افعال و اعمال کو جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے ورنہ باطل حکومت کے دور میں مومن کا محض سکوت اختیار کرلینا اتنی اہمیت کا حامل نہیں کہ اسے جہاد قرار دیا جائے۔ البتہ یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ مثبت عمل اور تبلیغی کام کے لئے کسی قسم کے مواقع میسر ہی نہ ہوں۔

سابقہ ادوار کے مختلف مراحل ایسے ہی تھے مگر عصرِ حاضر میں کم و بیش اکثر اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں عمل اور تبلیغ کے لئے فضاء سازگار ہے۔

تقیہ اور عملی تبلیغ

مذکورہ مقصد کے پیش نظر ائمہ معصومین علیہم السلام کے نزدیک اسلامی تعلیمات کی حفاظت اور اخوتِ اسلامی کے رشتے کو فروغ دینے کا ایک موثر ذریعہ تقیہ تھا چنانچہ ائمہ اہل بیتؑ ہمیشہ اسلامی اتحاد کی حمایت کرنے والے اور اس کی طرف دعوت دینے والے اور تفرقہ و

فرقہ واریت کے سخت ترین مخالف تھے اسی طرح وہ اپنے شیعوں اور پیروکاروں کو بھی ایسی ہی تعلیم دیا کرتے تھے اور سخت سے سخت حالات اور نفرت بھرے ماحول میں دیگر مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اياكم ان تعملوا عملا نصير به فان وللسوء يعيلو والده بعمله كونو امن انقطعم اليه زينا ولا تكونواعليه شينا صلوافى عشائر هم و عودوا مرضا هم واشهدو واجنائز هم ولا يسقونكم الى شى من الخير فانتم اولى به منهم والله ما عبدالله بشى احب اليه من الخباء قلت وما الخباء :قال: التقيه

"تم (اے شیعو!) کوئی ایسا کام مت کرو جو ہمارے لئے بدنامی کا باعث ہو کیونکہ بدکردار بیٹا باپ کے لئے بدنامی کا باعث بنتا ہے۔ تم اپنے ائمہ اور بزرگوں کے لئے زینت کا باعث بنو۔ ان کے لئے بدنامی کا سبب نہ بنو مخالفین کے قبائل و عشائر میں جاکر ان کے ساتھ نماز پڑھو ' ان کے مریضوں کی عیادت کرو ' ان کے تشیع جنازہ میں شرکت کرو ' وہ (مخالفین) تم سے کسی خیرو بھلائی میں سبقت نہ لے جائیں ' تم اس سلسلہ میں ان سے زیادہ سزاوار ہو ' اللہ کی قسم خدا کی پرستش جتنی خباء کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اتنی کسی دوسری شے کے ذریعہ نہیں ہوئی۔ راوی نے دریافت کیا خباء کیا ہے ؟ امام نے فرمایا: تقیہ"۔

(وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۷۱)

یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ ایک تاریک اور ظلم و ستم سے بھرے ہوئے دور میں اصلاحِ معاشرہ کا مقصد ظالم حکومت کے خلاف علی الاعلان جنگ و تصادم کا راستہ اختیار کرنے سے پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کا مسلح تصادم داعیانِ حق کے خاتمے کی راہ ہموار کرتا ہے اور ظالم حکومت متحرک اور انقلابی افراد کو چن چن کر قتل اور ان کی تحریک کا قلع قمع

کرسکتی ہے تاکہ ان کی حکومت کو ان کے شیطانی منصوبوں' ناپاک عزائم اور ناجائز خواہشات کی تکمیل سے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ رہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اتقوا علی دینکم واحجبوہ بالتقیہ ..... ولوان الناس علموا مافی اجو افکم انکم تحبوننا اھل البیتؑ لاکلو کم بالسنتھم ولخلوکم فی والسروالعلانیہ

"(اے شیعو!) اپنے دین کے بارے میں ڈرتے رہو اس کی حفاظت کرو اور اسے تقیہ کے ذریعہ پوشیدہ رکھو ..... اگر لوگوں کو تمہارے مافی الضمیر کا علم ہوجائے کہ تم اہل بیتؑ سے محبت کرتے ہو تو وہ تم کو کھا جائیں گے اور پوشیدہ و علانیہ دونوں حالتوں میں تمہاری برائی کرتے رہیں گے"۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۶۱)

تقیہ دراصل تقدم اہم بر مہم یعنی ایک اہم ترین فریضے کی خاطر ایک کم اہم فریضے کو قربان کرنے کا نام ہے اور جب تک اہم ترین فریضہ کے لئے مکمل اور بہتر طور پر حالات سازگار نہ ہوں تو کوئی ایسا اقدام کرنے سے گریز کیا جائے جس میں افرادی' مالی اور فکری قوت رائیگاں چلے جانے کا خطرہ ہو' یہاں سے یہ معلوم ہوا کہ تقیہ دراصل زیرِ زمین حرکت و عمل کا ایک بہترین نقشہ ہے جو اسلام نے اپنے پیروکاروں کو بوقتِ ضرورت کام کرنے کے واسطے پیش کیا ہے اور دورِ حاضر میں کم و بیش تمام اسلامی تنظیمیں اور انقلابی تحریکیں اسی راہ پر گامزن ہیں۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ تقیہ پر عامل کچھ تنظیمیں نظریاتی' مذہبی اور تاریخی طور پر تقیہ کے تصور کی مخالف ہیں۔ مگر عملی میدان میں انہوں نے بڑی "فراخ دلی" سے تقیہ کو اپنایا ہوا ہے نیز تاریخ اس حقیقت کی بھی گواہ ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے خلاف چلنے والی تمام تحریکوں اور اٹھنے والے تمام انقلابات کا طریقہ کار یہی تھا کہ ان کے لئے ایک خاص مدت تک زیرِ زمین کام کیا گیا' مخفی طور پر لوگوں کو دعوت دی گئی اور ضرورت کے مطابق وسائل' سازوسامان' افرادی قوت اور ماحول سازی کے بعد حکومت کے خلاف مسلح اقدام اور علانیہ

جدوجہد کی راہ اختیار کی گئی۔

تقیہ کے مثبت اثرات

بنابریں تقیہ کے صحیح مفہوم پر عمل کے ذریعہ روحِ عمل، جذبہ جہاد اور اصلاحِ معاشرہ کے ولولہ انگیز احساس کی بقاء و دوام کی ضمانت میسر ہوتی ہے، تقیہ ہی مومنین کے دلوں میں اسلامی حکومت اور قرآنی تعلیمات کے اصلی چہرہ کو دوبارہ دیکھنے کی امید زندہ رکھتا ہے۔

تقیہ ہی وہ معقول منہاجِ عمل ہے جس پر چل کر فکری انحراف، اخلاقی فساد اور ہر قسم کی بدعتوں کے خلاف بھرپور جدوجہد اور ہمہ گیر انقلاب بپا کرنے کے لئے موزوں مواقع فراہم ہوسکتے ہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس پر کاربند ہو کر اصلاحِ امت کا عظیم فریضہ بھی انجام پاسکتا ہے۔ چنانچہ امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ان التقیہ یصلح اللہ بھا امہ لعاحبھا مثل ثواب اعمالھم فان ترکھا اھلک امہ تارکھا شریک من اھلکھم۔

"بے شک اس تقیہ کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ کی ملت و امت کی اصلاح کرتا ہے تقیہ کرنے والے کا ثواب اس اصلاح شدہ ملت کے ثواب کے برابر ہے لیکن جس نے تقیہ ترک کیا گویا اس نے ایک قوم کو تباہ کردیا (اس حالت میں) تقیہ ترک کرنے والا اس قوم کو ہلاک کرنے والے کے جرم میں شریک ہے"۔ (وسائل جلد ۱۱ صفحہ ۴۷۳)

اصلاحِ امت، مومنین کے منفی رویہ سے ممکن نہیں بلکہ یہ مقصد مثبت عمل اور پیہم جدوجہد ہی سے پورا ہوسکتا ہے۔ آیا اگر مومنین تقیہ کی حالت میں معاشرہ اور اس کے مسائل و مشکلات سے لاتعلق رہیں اور صرف انفرادی اعمال اور نماز و روزہ جیسے فرائض انجام دیتے رہیں تو امت کی فکری، عملی، اخلاقی، اور عقائدی، اصلاح ممکن ہے؟ آیا یہ اصلاح کا عمل ظالمین و مفسدین کے ذریعہ انجام پائے گا؟ یا معجزانہ طور پر امت خود بخود اصلاح پاجائے گی؟

بنابریں تقیہ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ تقیہ ہر دور میں اسلامی عمل اصلاحِ معاشرہ ہمہ گیر اصلاحِ امت اور ہر زاویۂ زندگی میں انقلاب برپا کرنے کا مناسب ترین طریقہ تلاش کرنے کا

سنہری موقع فراہم کرتا ہے اس کے نتائج کبھی دھماکہ خیز ہوتے ہیں اور کبھی رفتہ رفتہ ظاہر ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ تقیہ کی برکات اور اس کے مثبت اثرات کی گواہ ہے۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے تقیہ کے نتیجے میں ان کا پانچ سالہ دور حکومت وجود میں آیا۔ جو رہتی دنیا تک عدل و انصاف کا نمونہ بن گیا۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی صلح سے شہادت تک کا دور اور امام حسین علیہ السلام کے دس سالہ تقیہ کا پھل عالم اسلام کو ہلا دینے والے انقلاب کی صورت میں کربلا میں نمودار ہوا۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے تقیہ کا فائدہ وہ اسلامی علوم و معارف کے خزانے ہیں جن سے دنیا آج تک فیضیاب ہو رہی ہے۔

دورِ حاضر میں تقیہ اور معقول منہاجِ عمل کو اختیار کرنے کا نتیجہ ایران کا وہ عظیم الشان اسلامی انقلاب ہے جس نے عالمی استکبار اور مادی مکاتبِ فکر کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا اور انسانیت کی روح کو جھنجھوڑ کر ذہنوں کو جلا بخشی اور ظلم و ستم کے پنجوں میں جکڑے ہوئے انسانوں میں اپنی شخصیت کا احساس پیدا کیا۔

خلاصہ کلام

انتظار اور تقیہ کے مفاہیم میں اعتراض کا کوئی پہلو نہیں اور یہ مفاہیم مسلمانوں کی زندگی میں کوئی فکری و عملی خلل بھی ایجاد نہیں کرتے بلکہ کچھ اور دیگر مفاہیم کی طرح مذکورہ مفاہیم سے بھی نا آگاہی یا خود غرضی کی بنیاد پر غلط نتائج اخذ کئے گئے ہیں اور اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اصل مفہومِ انتظار اور تصورِ مہدیؑ اور حقیقتِ تقیہ سے انکار کیا جائے۔

اس طرح تقیہ اور مفہومِ انتظار سے غلط فائدہ اٹھا کر ذمہ داری اور دعوت و تبلیغِ اسلام کے اہم ترین فریضے سے بری الذمہ ہونا بڑا جرم و گناہ ہے۔ چنانچہ یہ منفی خیال ان دلائل کے سامنے نہیں ٹھہر پاتا جو عمل اور دعوتِ اسلامی کی ضرورت کے موضوع پر

ہم نے قائم کئے تھے۔

دوسرا بہانہ ـــــ صرف علماء کی ذمہ داری ہے

اسلامی عمل اور تحریکِ اصلاح کے حوالے سے یہ دوسرا گروہ ' اصلاح معاشرہ اور عمل کا شرعی جواز قبول کرنے کے بعد' اس عمل سے پہلوتہی کے لئے یہ بہانہ پیش کرتا ہے کہ اس عمل کی انجام دہی صرف علماء کی ذمہ داری ہے۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ اسلامی عمل اور فردو معاشرہ کی اصلاح کی ذمہ داری صرف اور صرف علماء و دانشوروں پر عائد ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ یہ افراد اسلامی مفاہیم و معارف سے دوسروں سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں۔

اس خیال کا سرچشمہ یا تو ان افراد کا اسلامی اصول و نظریات سے ناآشنا ہونا ہے یا یہ لوگ یہ بہانہ پیش کرکے اپنی ذمہ داری سے فرار چاہتے ہیں۔ وگرنہ اسلامی تعلیمات میں جوابدہی کے تصور کے تحت ہر مسلمان پر اپنی اپنی عملی' اجتماعی اور فکری بساط کے مطابق یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں اور بنی نوع انسان کے مسائل و مشکلات کے حل کے لئے بھرپور کردار ادا کرے ۔ حدیثِ رسولؐ ہے۔

کلکم راع و کلکم مسوول عن رعیتہ

"تم سب نگہبان ہو اور ہر ایک سے اپنی ذمہ داری کے دائرے کے تحت سوال کیا جائے گا"۔

اس طرح قرآن کریم میں اوامر و نواہی اور دوسرے خطابات مطلق ہیں۔ جن میں سارے مسلمان شامل ہیں اور اس قسم کے خطاب میں علماء و غیر علماء کی تمیز نہیں رکھی گئی ۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء کی ذمہ داری بحیثیت قائد و مرشد اور حاملِ آگہی ہونے کے دوسرے مسلمانوں سے زیادہ ضرور ہوتی ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ باقی مسلمانوں سے تبلیغ اور اسلام کی طرف دعوت کا فریضہ ساقط ہے۔ قرآنِ کریم تبلیغِ دین کے سلسلے میں علماء کی ذمہ داری اور دعوتِ حق سے متعلق ان کے فریضے کو یوں بیان کرتا ہے۔

واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوالکتاب لتبینہ للناس و لا تکتمونہ فنبذ وہ وراء ظہورہم"۔

"جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی اس بات کا عہد لیا تھا کہ ضرور تم اس کو تمام آدمیوں سے کھول کر بیان کرنا اور اس کو پوشیدہ نہ رکھنا مگر انہوں نے عہد خدا کو پس پشت ڈال دیا"۔
(سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۸۷)

مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملو ھا کمثل الحمار یحمل اسفارا

"ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بار ڈالا گیا تھا۔ پھر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا اس گدھے کی سی مثال ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہو"۔ (سورہ جمعہ ۶۲ آیت ۵)

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علماء کی ذمہ داری بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اذا ظہرت البدعہ فی امتی فلیظہر العالم علمہ فمن لم یفعل فعلیہ لعنتہ اللہ"۔

"اگر میری امت میں بدعتیں ظاہر ہوجائیں تو صاحبانِ علم پر لازم ہے کہ اپنے علم و معرفت کے اسلحہ سے ان بدعتوں کا مقابلہ کریں ورنہ ان پر خدا کی لعنت ہو"۔ (کافی جلد ا صفحہ ۴)

مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام علماء کے عظیم فریضہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

وما اخذ اللہ علی العلماء ان لایقار واعلی کظتہ ظالم ولاسف مظلوم

"اور وہ عہد و میثاق نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ (علماء) ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں"۔ (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳)

علماء کی اقسام

ہمارے معاشرے کی بے شمار خامیوں میں سے ایک نمایاں خامی یہ ہے کہ اصلاحِ معاشرہ اور دعوت و تبلیغِ اسلام کی ذمہ داری علماء پر ڈالی تو جاتی ہے لیکن معاشرے میں باعمل علماء کو کوئی مقام و منزلت دی نہیں جاتی۔ اس بنا پر کوئی ان کی باتوں پر کان بھی نہیں دھرتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کچھ لوگوں کا نظریہ تو یہ ہے کہ علماء اپنی ذمہ داری صرف اور صرف مساجد و مدارس کی چہار دیواری کی حدود میں رہ کر انجام دیں۔

ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسرے طرف علماء کرام یہ کہہ کر تبلیغ و دعوت اسلام اور اصلاح معاشرہ کے فریضے سے دامن بچاتے ہیں کہ " اس معاشرے میں حق و حقیقت کی بات سننے والا کوئی نہیں ہے اگر کچھ لوگ ہیں بھی تو ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے "۔

یہ موقف بھی ان علماء کرام کا ہے جو بنیادی طور پر ضرورتِ اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ اخلاق کا ادراک رکھتے ہیں اور عہدِ غیبتِ کبریٰ میں تعلیماتِ اسلامی کی نشر و اشاعت اور حکومتِ قرآن کی تشکیل کے قائل ہیں مگر علماء کے ایک دوسرے گروہ کا حال تو ناگفتہ بہ ہے جو اصلاحِ معاشرہ اور اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت کا احساس و شعور بھی نہیں رکھتا چہ جائے کہ اس سلسلہ میں عملی کام انجام دے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایسے علماء یا اپنے آپ کو ان کی صف میں شمار کرنے والے ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو دانستہ یا نادانستہ طور پر قوم کو جاہل و گمراہ رکھنے، فرقہ واریت، مذہبی تعصبات اور مسلمانوں کو باہم دست و گریبان کرانے کو اپنا مذہبی فریضہ اور زندگی کا وتیرہ بنائے ہوئے ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ حقیقی اور باعمل علماء اور معاشرے کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہے لہٰذا علماء و مفکرینِ قوم کو چاہئے کہ اس خلیج کو پاٹتے ہوئے، سارے مسلمانوں بالخصوص جوان اور نوجوان طبقے کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے ان کی فکری و اخلاقی تربیت کا انتظام کریں تاکہ تمام طبقات کی شرکت سے اسلام کی خدمت، قرآن کی

نشرو اشاعت، دین کی تبلیغ اور معاشرہ کی اصلاح کا اہم عمل انجام پاسکے۔

تیسرا بہانہ ـــــ امکانات کی قلت

ایک بہانہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ دشمنانِ اسلام کے پاس بے شمار طاقت اور امکانات پائے جاتے ہیں جبکہ ہمارے پاس امکانات کی کمی ہے لہٰذا ان سے ہمارا مقابلہ ممکن نہیں

جواب :۔ اصولی طور پر انسان پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالی گئی ہے جتنی اس میں قوت ہے اور کوئی ایسا کام اس سے مطلوب نہیں جس کی انجام دہی سے وہ عاجز ہو۔قرآن کریم کی آیات صریحاً بیان کرتی ہیں کہ ۔

لایکلف اللہ نفسا الا وسعہا

"اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیتا"۔ (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۸۲)

لہٰذا آپ کی قوت و قدرت محدود ہونے کی صورت میں آپ سے ہرگز یہ مطلوب نہیں کہ آپ بڑی طاقتوں سے مقابلہ اور نبرد آزمائی کریں۔

اصلاحِ معاشرہ، تبلیغِ اسلام اور دعوتِ حق بڑی طاقتوں سے ٹکر لئے بغیر بھی ممکن ہے البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں تخریب کے وسائل اور دین و اخلاق سے بے گانہ کرنے والے ذرائع اتنے وافر اور سستے داموں دستیاب ہیں کہ جن پر کنٹرول کرنا فی الحال ایک مبلغ کی قدرت سے باہر ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ (مبلغ) تخریب کاری کے وسائل سے مرعوب ہوکر اپنے مذہبی و انسانی فریضے سے دستبردار ہوجائے ۔

دراصل یہ بہانہ پیش کرنے والے افراد اپنی طاقت و قدرت سے غافل اور ناواقف ہیں لہٰذا وہ اس طرح سوچنے لگے ہیں ۔ وگرنہ اگر مشکلات و مصائب اور دشمنانِ اسلام کی قوت و طاقت کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے میں پائے جانے والے مخفی و پوشیدہ وسائل کا جائزہ بھی لیا جاتا اور اپنی مذہبی ذمہ داری کا احساس بھی کرلیا جاتا تو اس بہانے کو پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہ جاتی۔

چوتھا بہانہ ـــــ دورِ حاضر میں اسلامی عمل بے سود ہے

یہ خیال کہ "دورِ حاضر میں اسلامی عمل بے سود ہے" بھی اسلامی عمل کی انجام دہی کی راہ کی رکاوٹوں میں سے ایک ہے۔

اس بہانے کا سرچشمہ مایوسی اور ناامیدی ہے یا وہ افراد اس خیال کا اظہار کرتے ہیں جو اپنی مساعی اور جدوجہد کا نتیجہ جلد دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ دراصل اسلامی عمل کی کامیابی کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ داعیٔ اسلام اپنے میں سے جلد بازی کے عنصر کو ختم کردے' اپنی توجہات جلد رونما ہونے والے نتائج پر مرکوز نہ رکھے بلکہ اس کا ہم و غم اور نصب العین صرف اور صرف اپنے مذہبی اور انسانی فریضہ کی ادائیگی ہو۔ خواہ اس کے نتائج جلد سامنے آئیں یا دیر سے۔ خود نتائج کے ظہور میں تعجیل یا تاخیر اس بات پر موقوف ہے کہ عمل اور دعوت کے شرائط' امکانات اور اس کے لئے مناسب ماحول کس حد تک سازگار ہے اور اسلامی عمل اور کارِ خیر کی راہ میں پائے جانے والے موانع کی حدت و شدت کس حد تک ہے۔

یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ روئے زمین پر کوئی انسانی معاشرہ بھی ایسا نہیں جس میں سارا کا سارا عمل رائیگاں جائے۔ ہر معاشرے میں کم از کم امکانِ تاثیر ضرور پایا جاتا ہے قرآن کریم اسی امکانِ تاثیر کی بنیاد پر امر و نہی اور دعوتِ حق کو لازم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسی امکانِ ہدایت و تاثیرِ دعوت کو نظرانداز کرنے والوں پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔ بنی اسرائیل کا واقعہ اس بات کی محکم دلیل ہے کہ دعوت کی شرط صرف امکانِ ہدایت اور احتمالِ تاثیر ہے اور دعوت و تبلیغ کے اثر انداز ہونے کا علم و یقین ہونا ہرگز شرط نہیں۔ ارشادِ باری ہے کہ۔

> "اور جب ان میں سے ایک گروہ نے یہ کہا تھا کہ تم ان لوگوں کو نصیحت ہی کیوں کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا ان کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے تو انہوں نے (جواباً) کہا تھا (ہم تو) تمہارے رب کے حضور میں الزام سے بری ہونے کی غرض سے

(نصیحت) کرتے ہیں اور اس لئے کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں ۔ پھر جس وقت انہوں نے اسکو بھلادیا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو بدی سے منع کرتے تھے اور ان کو جو ظلم و نافرمانی کیا کرتے تھے بوجہ اپنے فسق و فجور کے بڑے عذاب میں گرفتار کرلیا"۔ (سورہ اعراف ۴ آیت ۱۵۔۱۶)

مردِ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا فریضہ انجام دیئے جاتا ہے اور اس کے نتائج اللہ کی حکمت و مشیت پر چھوڑ دیتا ہے اس لئے کہ اس کو یقین ہے کہ اس کی محنت اور صعوبتوں کا اجر خدا ہی دے گا اور آنے والے مردانِ حق اور داعیانِ حقیقت اس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس کے مشن کو مزید آگے بڑھائیں گے ۔ اور اس کا عمل مستقبل میں تبلیغ و دعوتی کاموں میں سنگِ میل ثابت ہوگا۔

یہاں سے واضح ہوا کہ اسلامی عمل کی افادیت میں شک اور خدشہ کا اظہار نا صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ حقائق پر مبنی بھی نہیں ہے ۔ انشاء اللہ اس موضوع کی مزید وضاحت "صفاتِ مبلغ" والے باب میں کریں گے۔

پانچواں بہانہ ـــــ زہد و تقویٰ کا تقاضا

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ زہد و تقویٰ کا تقاضہ ہے کہ کسی دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے اور محض نماز، روزہ اور دیگر دینی فرائض کی انجام دہی سے غرض رکھی جائے۔

یہ بات ضعفِ نفس، کمزور ایمان اور متزلزل تقویٰ کی دلیل ہے چنانچہ یہ بہانہ کرنے والے کے فہمِ دین میں نقص پایا جاتا ہے۔ تاریخِ اسلام زہد و تقویٰ کے پیکر ایسے مردانِ حق سے بھری پڑی ہے جنہوں نے دین کی تبلیغ و ترویج کے لئے جہد و مبارزہ میں زندگی گزار دی اور دنیا آج تک ان کے زہد و ورع کی معترف ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ حضرات زہد و تقویٰ میں خلل آنے کے خدشے کو عمل نہ کرنے کے بہانے کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن انہیں امر بالمعروف و نہی از منکر کے

دو اسلامی فریضوں کے ترک کرنے کے نتیجے میں ملنے والے عذاب و سزا کی پرواہ نہیں۔ کیا ان حضرات کا اسلامی عمل سے احتراز زہد و تقویٰ کے منافی نہیں ہے؟

ایک عظیم اور صاحبِ بصیرت جید عالمِ دین سے منقول ہے کہ۔

"ایک مرتبہ تبلیغی دورے کے موقع پر ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے سوال کیا اس مجمع میں سب سے زیادہ متقی و پرہیز گار شخص کون ہے؟ تمام شرکاء اجتماع نے اس سلسلے میں ایک فرد کی نشاندہی کی اور اس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ شخص کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتا جبکہ ہم میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

عالم دین نے فرمایا۔ یہ شخص تو انسان کے روپ میں جانور ہے کیونکہ انسان ایک دوسرے کے حالات اور دکھ و سکھ سے جدا نہیں رہ سکتے"۔

پیغمبرانِ الٰہی اور خاصانِ خدا نے اپنی پُربرکت زندگیاں خلقِ خدا کی ہدایت، دعوتِ حق اور اسلامی نظام پر مبنی معاشرے کے قیام کی راہ میں صرف کیں۔ ہمارے پیارے نبیؐ اور آپؐ کے جانشین ائمہ معصومینؑ کا یہی وتیرہ رہا اور ان کے نزدیک زہد و تقویٰ اور اس مذہبی فریضے کی بجاآوری کے درمیان کوئی تضاد نہیں تھا پھر بھی نہ جانے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ تفریق کہاں سے در آئی۔ یہ خیال اتنا بے بنیاد اور غلط ہے کہ ہم اس کی رد میں کسی قسم کے شرعی و عقلی دلائل پیش کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے۔

چھٹا بہانہ ـــــ مادی مفادات

مادی مفاد اور مقام و شہرت کی خاطر اسلامی عمل سے گریز کرنے والوں سے کیا کہا جائے؟ صرف نصیحت کے طور پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی قدر و قیمت شکم پرستی میں نہیں بلکہ خدا پرستی میں مضمر ہے۔

ساتواں بہانہ ـــــ گھریلو مسائل

بہت سے افراد اسلامی عمل انجام نہ دینے کا یہ بہانہ پیش کرتے ہیں کہ گھریلو مسائل کی کثرت' عائلی زندگی کی مصروفیات اور ملازمت وغیرہ ..... کچھ ایسی لاینحل مشکلات ہیں جن کے ہوتے ہوئے سانس لینے کی فرصت نہیں چہ جائے کہ انسان دوسرے افراد اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے وقت نکالے۔

ایسے افراد اپنے موقف پر استدلال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

" مولانا صاحب انسان ہونے کے ناطے ہم پر گھریلو ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اگر ہم ان ذمہ داریوں کی جانب توجہ نہ دیں تو زندگی کا سارا کا سارا نظام درہم برہم ہوکے رہ جائے اور پھر والدین' بیوی اور بچوں کے نان و نفقہ کا انتظام ہمارا مذہبی فریضہ بھی ہے"۔

مذکورہ بالا مصروفیات اور ذمہ داریوں کی ادائیگی سے اختلاف کی گنجائش نہیں پھر اسلام بھی نہیں کہتا کہ خود اپنا گھر برباد کرکے دوسروں کی آبادکاری کا اہتمام کرو' افرادِ معاشرہ' عورتوں' بچوں اور مردوں کی ہدایت و تبلیغ کی خاطر اپنے بچوں اور گھر والوں کو تباہ کردو' دوسروں کی مشکلات کے حل کی خاطر اپنی مشکلات میں اضافہ کرلو۔

ایک مردِ مومن جو فرض شناس اور مقصدِ تخلیق کے تقاضوں سے آگاہ ہو وہ مذکورہ تمام کام بخیر و خوبی انجام دے سکتا ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی کے تمام اوقات و لحظات ایک مکمل پروگرام اور جامع نظام الاوقات کے مطابق گزار سکتا ہے اور اسی نظام الاوقات میں زندگی کا ایک حصہ دینِ مقدسِ اسلام کی تبلیغ و ترویج' خدمت خلق اور اصلاح معاشرہ کے لئے مخصوص کرسکتا ہے۔ مثلاً چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ ان فرائض کی بجاآوری کے لئے مخصوص کردیا جائے تو زندگی کا نظام بھی درہم برہم نہیں ہوتا اور مذہبی فریضے پر بھی عمل ہوسکتا ہے۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

مذکورہ بالا حیلے بہانے پیش کرنے والے اکثر اپنے دعوے میں سچے نہیں ہوتے بلکہ

بے دلیل بہانے تراشتے ہیں تاکہ اپنے منفی موقف کا دفاع کر سکیں۔

دراصل انسان کا اپنے وجودی فلسفے، غرضِ تخلیق اور خلافتِ الٰہیہ کے عظیم منصب کے تقاضوں سے ناآشنا ہونا اس امر کا باعث بنا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی بجاآوری سے منہ پھیرے۔

اسلامی عمل سے گریز کرنے کی مذکورہ وجوہات کے علاوہ کچھ اور بہانے بھی بتائے جاتے ہیں مگر ہم نے اس لئے ان پر گفتگو نہیں کی کہ یا تو ان کی اہمیت کم ہے یا پھر وہ مذکورہ بہانوں میں سے کسی ایک کے زمرے میں آتے ہیں۔

☆—☆—☆

باب سوم

عمل کی اقسام

ہر سماج میں معاشرتی فلاح و بہبود اور اصلاح کے لئے متعدد گروہ اور منظم ادارے سرگرمِ عمل ہوتے ہیں ان گروہوں یا اداروں کی جانب سے جو منصوبے پیش کئے جاتے ہیں اور جن خطوط پر وہ اپنے کام انجام دیتے ہیں ان کی مختلف اقسام اور متعدد کیفیات ہوتی ہیں۔ ان اقسام اور کیفیات سے داعیانِ دین اور مبلغینِ اسلام کی کماحقہ، آگاہی کی غرض سے ہم بقدرِ ضرورت ان کا جائزہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سلسلہ میں اپنا موقف بھی پیش کرتے ہیں۔

(۱) فلاحی عمل

(۲) اصلاحی عمل

(۳) انقلابی عمل

عمل کے بارے میں یہ ابتدائی تقسیم ہے ذیل میں ہم اس تقسیم کے ہر نکتہ پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

۱۔ فلاحی عمل (سماجی بہبود)

فلاحی عمل سماجی بہبود کے عنوان سے ایسے کام انجام دیئے جاتے ہیں۔ جن کے

ذریعہ کسی علاقہ کے افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کی راہ میں قدم بڑھایا جاسکے۔ جیسے تعلیمی اداروں اور لائبریریز' اسپتال اور طبی مراکز کا قیام۔

سماجی بہبود کے کاموں میں سرگرمِ عمل بعض افراد ان کاموں کی انجام دہی میں اپنی تمام توانائیاں صَرف کردیتے ہیں اور اس قسم کی خدمات انجام دینے کے بعد خود کو تمام مذہبی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برا سمجھنے لگتے ہیں۔

دینی سطح پر بھی اس قسم کے کام اسلام و مذہب کی خدمت اور تبلیغ و دعوت کے لئے انجام دیئے جاتے ہیں جیسے مساجد اور دینی مدارس کی تاسیس' دینی مجلّات اور مذہبی کتب کی نشرو اشاعت کا اہتمام' مذہبی مناسبات پر محافل اور مختلف موضوعات پر درس اور لیکچرز کا انعقاد وغیرہ۔

ہمارا موقف

ان کاموں کے ضروری اور مفید ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ انہی کاموں کے ذریعہ اسلام کے معارف' قرآن کے حقائق اور دینِ الٰہی کے اہداف و مقاصد سے معاشرہ کو روشناس کرایا جاسکتا ہے چنانچہ یہی کام مستقبل میں ہمہ گیر انقلاب اور مکمل تغیر کی بنیاد ثابت ہوں گے۔

لہٰذا جہاں ضروری ہو مبلغ اور داعیانِ اسلام کو اس قسم کے کاموں کی بذاتِ خود انجام دہی اور دوسرے افراد اور گروہوں سے اس سلسلہ میں تعاون سے دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

ان کاموں کی انجام دہی کے سلسلہ میں ہمارا اختلاف ان حضرات سے ہے جو محض ایسے ہی کاموں پر انحصار کرتے ہیں البتہ اگر شخصی حالات' علاقائی اور جغرافیائی خصوصیات اور وقت کے تقاضے کچھ ایسے ہوں کہ آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ ہو تو مذکورہ خدمات پر اکتفا اور انحصار کیا جاسکتا ہے لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ مذکورہ خدمات کے نتیجہ میں حاصل شدہ ثمرات اصل مقصد اور بنیادی ہدف تک پہنچنے کا وسیلہ

ثابت ہوں۔

اگر اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو یہاں فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے اور یہ اصولِ تبلیغ اور دعوت کی حکمت کے سراسر منافی ہے۔

ایک مرتبہ پھر یاد دلادیں کہ مندرجہ بالا خدمات کو بذاتِ خود ہدف قرار دینا درست نہیں بلکہ یہ بلند ہدف' اعلیٰ مقصد' اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ اور حکومت الہیہ کے قیام کی راہ میں ممد ومعاون نیز اصلاحِ معاشرہ' اصلاحِ ذات' عدل و انصاف کے پھیلاؤ' ظلم و جور کے خاتمے اور صرف اور صرف اللہ کی عبودیت کے مظاہر اور قانون سماوی کی بالادستی کا ذریعہ ہوسکتی ہیں۔

اس کے برعکس بعض حضرات مذکورہ خدمات ہی کو ہدفِ زندگی قرار دیتے ہیں۔ علم برائے علم ہی کے حصول میں محو رہتے ہیں' دینی مدرسہ قائم کرنے سے ان کا مقصد محض ایک اور مدرسہ کا اضافہ ہوتا ہے۔ جدید تقاضوں کے مطابق دین کی تبلیغ اور مبلغین کی تیاری سے انہیں کوئی سروکار نہیں اسی بنا پر خود عصرِ حاضر میں قائم ہونے والے مدارس دینیہ کا نصاب بھی جدید تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے ایسا نصاب جو طالب علم کی تربیت معاشرہ کی ضروریات کے مطابق نہ کرسکے بلکہ طالب علموں کو مسلم معاشروں پر گزرنے والے حالات' مشکلات اور مسائل سے الگ تھلگ رکھنے کا سبب ہو اور انہیں فرسودہ خیالات کی جگہ جدید طرز تفکر' نئی فکر' نئی روح اور عصرِ حاضر میں ان کی سنگین ذمہ داری کا شعور و احساس نہ دے سکے تو یہ مدرسے اور ان سے فارغ التحصیل طلباء مستقبل میں مسلم معاشرہ کے لئے مفید اور سودمند ثابت نہ ہوسکیں گے بلکہ تجربہ نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح منصوبہ بندی اور درست تربیت کے بغیر فارغ التحصیل ہونے والوں کی خاصی بڑی تعداد معاشرہ میں یا تو بے کار رہی یا اس کے لئے مضر ثابت ہوئی یا پھر ان کی صلاحیت اور قابلیت کے باوجود معاشرہ نے ان سے بہت کم استفادہ کیا۔

۲۔ اصلاحی عمل

موجودہ دور میں اصلاح کی اصطلاح سے مراد لی جاتی ہے کہ کسی معاشرہ میں رائج نظام ' رسم و رواج ' عادات و اطوار ' اقدار و روایات کے ایسے ایک یا متعدد پہلوؤں کو بدل دیا جائے جن میں انحراف و تحریف رونما ہو چکی ہو۔ یا سیاسی' سماجی اور معاشرتی امور سے مربوط اس فکر میں ترمیم کی جائے جو لوگوں کی مشکلات و مسائل کے حل کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہو۔

چنانچہ کبھی سیاسی نظام کی اصلاح تو کبھی ثقافتی اور اقتصادی نظام کی اصلاح کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح بعض داعیانِ اصلاح صرف اصلاحِ عقیدہ کے قائل ہیں اور مسلمانوں کے فاسد اور شرک آمیز عقائد کی اصلاح چاہتے ہیں۔

اصلاح کے یہ تمام مطالبات رائج نظام میں محض ترمیم تک محدود ہیں اور ان کا مقصد اصل نظام کی روح کو باقی رکھتے ہوئے محض اس میں معمولی سی ترمیم یا تبدیلی کرنا ہوتا ہے اس کی مثال اس عمارت کی سی ہے جس کے پرانے ڈھانچے کو برقرار رکھتے ہوئے اسے نئی شکل دے دی جائے یا اس میں نئی ضروریات کے مطابق جدید وسائل فراہم کر دیئے جائیں۔

ہمارا موقف

مذکورہ اصلاحی عمل بذاتِ خود اچھا قدم ہونے کے ساتھ ساتھ بعض حالات میں لازمی اور ضروری بھی ہوتا ہے اور یقیناً اس قسم کا عمل ایک ہمہ گیر انقلاب کے لئے ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے مگر ملکِ عزیز پاکستان اور ایسے ہی حالات رکھنے والے دوسرے اسلامی ممالک میں اس کے ذریعہ ان اسلامی اہداف و مقاصد کا حصول نہ صرف ناممکن ہے جن کے لئے خداوند تعالیٰ نے انبیاء و رُسُل مبعوث فرمائے بلکہ ایسے معاشرے میں اصلاحِ عمل سراسر بے جواز ہے۔

کیونکہ اصلاح کی نوبت تو اس وقت آتی ہے جب سیاسی معاشی' اقتصادی اور ثقافتی

نظام کا ڈھانچہ اسلامی نظریات و تصورات پر قائم ہو اور اس میں گوناگوں وجوہات یا تطبیق و نفاذ کے موقع پر فکری عملی یا تشریحی سطح پر کوئی انحراف پیدا ہوا ہو جس کی اصلاح مقصود ہو۔

اگر مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہو اور معاشرے میں رائج اقدار، روایات، عادات و اطوار اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی بھی شعبہ اسلامی اصول و نظریات پر مبنی نہ ہو بلکہ ان کا سرچشمہ اجنبی اور اسلام مخالف نظریات ہوں تو ایسے معاشروں میں ایک ایسے بنیادی عمل کی ضرورت ہے جو افراد کے باطن میں بھی تبدیلی لائے نیز انسانی معاشرے کے تمام شعبہ ہائے حیات سے غیر اسلامی نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر اس کی جگہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ایک مکمل نظامِ حیات کا نفاذ بھی کرے۔

۳۔ انقلابی عمل

سابقہ مباحث سے یہ معلوم ہوا کہ فلاحی اور اصلاحی عمل سے وہ سارے نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے جو بعثتِ انبیاءؑ اور اسلام کی آمد کا مقصد ہیں۔

اس دور میں معاشرہ کی صورتحال اور بنی نوع انسان کے انفرادی واجتماعی حالات کے پیشِ نظر ایسے بنیادی عمل اور موثر کار و حرکت کی ضرورت ہے جو ایک مکمل اسلامی معاشرہ کے قیام کا ذریعہ بنے اور جس کے ذریعہ اسلامی نظام کی مکمل حکمرانی قائم ہو اور جو حکومتِ الٰہیہ کے تمام مقاصد بھی پورے کرسکے۔

بنی نوع انسان کی مکمل اور دائمی فلاح اور ہر شعبۂ حیات میں اسلامی تعلیمات کی حکمرانی جیسے عظیم مقاصد کا حصول صرف اور صرف انقلابی عمل سے ہی ممکن ہے چنانچہ تمام انبیاء کی دعوت اور تبلیغِ رسالت کا مقصد ایک مکمل معاشرتی انقلاب تھا۔

لقدارسلنا رسلنا با لبینات و انزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط

"بے شک ہم نے اپنے رسول کھلی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ہم نے

ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدالت پر قائم ہوجائیں"۔ (سورہ حدید ۵۷ آیت ۲۵)

ولقد بعثنا فی کل امتہ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت

"اور بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (و سرکش) سے بچو" (سورہ نحل ۱۶ آیت ۳۶)

اسی طرح انبیاء کا طریقہ کار اور منہاجِ عمل انقلابی اصولوں پر استوار تھا۔

ان ارید الا الاصلاح مااستطعت

"مجھ سے جہاں تک ممکن ہو میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں" (سورہ ہود ۱۱ آیت ۸۸)

توجہ رہے کہ اس آیت میں اصلاح سے مراد وہ اصلاحی عمل نہیں ہے کہ جس کا ذکر ہم نے عمل کی دوسری قسم کے حوالہ سے کیا ہے بلکہ یہاں اصلاح سے مراد انسانی معاشرہ کے ظاہر و باطن میں ایسی تبدیلی و تغیر لانا ہے جو غیر خدا کے حکم، عقیدہ و نظریات اور اخلاق و سلوک سے مکمل طور پر مبرا ہو اور جس میں حکمِ خدا مکمل طور پر جاگزین ہو۔

امام حسین علیہ السلام نے بھی انبیاء عظام کے عملی، فکری، اخلاقی اور ہر شعبہ حیات میں ہمہ گیر انقلاب کے وارث ہونے کے ناطے اپنے تاریخ ساز عظیم الشان انقلاب کا عنوان امت اسلامیہ کی اصلاح قرار دیا تھا۔ آپؑ فرماتے ہیں کہ۔

انی ماخرجت اشرا ولا بطرا و مفسدا ولا ظالما بل خرجت لطلب الاصلاح فی امت جدی رسول اللہ (ص)

"نہ میں ازروئے غرور و خود خواہی قیام کررہا ہوں اور نہ ہی تکبر اور (آسائشوں سے) اترائے پھرنے کی غرض سے اور نہ شروفساد اور ظلم و ستم کے پھیلاؤ کی خاطر بلکہ میرے اس قیام کا مقصد یہ ہے کہ میں

اپنے جدِ بزرگوار کی امت میں اصلاح کروں" (سخنانِ حسین ابن علیؑ ص ۳۶)

انقلاب کی اقسام

عمل کی اقسام کی طرح انقلاب کی بھی متعدد اقسام ہیں۔ یہ اقسام در حقیقت انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی ملک میں اقتصادی عدم توازن اور طبقاتی کشمکش کی بناء پر اقتصادی انقلاب کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے تو کہیں انسانی حقوق کی پائمالی اور ان کی کھلم کھلا خلاف ورزی انسانی حقوق کے تحفظ کی دعویدار تحریکوں کو جنم دیتی ہے اور کہیں اجنبی اقوام کے ظلم و ستم اور جابرانہ قبضہ سے نجات کے لئے آزادی کی تحریکیں شروع کی جاتی ہیں۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ مذکورہ بالا پہلوؤں میں انقلاب ہی کو زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب کا وسیلہ سمجھ لیا گیا۔ جیسا کہ کارل مارکس کا نظریہ تھا۔ اس نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں حتیٰ کہ مذہب اور اخلاق کو بھی اقتصادی عوامل کا نتیجہ قرار دیا۔ چنانچہ مارکسی نظریہ کے مطابق اقتصادی انقلاب ہی ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب کا بنیادی محرک ہے اور اس کے علاوہ دوسرے محرکات کی حیثیت ثانوی اور جزوی ہے اسی بناء پر اس کے نظریاتی حملوں کا سب سے زیادہ شکار سرمایہ دارانہ نظام رہا اور وہ اسی کے ملبے پر ایک نیا نظام قائم کرنے کا خواب دیکھتا رہا۔

ہمارا موقف

دور حاضر میں امتِ مسلمہ کسی ایک بیماری میں مبتلا نہیں ، بلکہ اسے متعدد امراض لاحق ہیں۔ جس شعبۂ حیات اور زندگی کے جس پہلو پر نگاہ ڈالی جائے حالت ناگفتہ بہ ہے۔

★ سیاسی میدان میں اجنبی افکار اور غلامانہ ذہنیت مسلط ہے۔

★ اقتصادی میدان میں حالت یہ ہے کہ سود خوری، چور بازاری، اور غیر ملکی قرضوں نے معیشت کو تباہ کر رکھا ہے۔ ایک طبقہ بسیار خوری سے بیمار ہے اور دوسرے طبقہ پر بھوک وفاقہ کشی کا عفریت مسلط ہے۔

★ سماجی میدان میں اسلامی شعائر' عادات واخلاق مفقود ہیں۔ اسلامی اخوت بھائی چارہ اور ایک دوسرے سے محبت والفت کے سارے رشتے منقطع ہو چکے ہیں اور مسلمان ایک معاشرہ' ایک محلّہ بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔ لسانی' علاقائی اور فرقہ وارانہ عصبیت عروج پر ہے۔

★ مغربی اور لادین نظامِ تعلیم رائج ہے' ثقافتی میدان میں مادی تہذیب وتمدن حاوی ہے۔

★ فکری طور پر الحاد اور مادہ پرستی کی جانب راغب ہیں۔ اسی رغبت نے ذہنی غلامی' پست ہمتی اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر رکھا ہے۔

★ عدالتی نظام مغربی قوانین پر مشتمل ہے۔

★ عسکری نظام کی حالت بھی بقیہ شعبوں سے مختلف نہیں۔ مسلمان ممالک بڑی طاقتوں کے اسلحے اور سازوسامان کی فروخت کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔

★ معاشرہ سے بندگیٔ رب کا تصور تک ختم ہونے کو ہے۔

★ دینی تعلیمات اور اسلامی اخلاق پر عمل یا تو مفقود ہے یا نہ ہونے کے برابر۔

جب کہ معاشرہ کے ہر شعبہ پر لادینیت اور الحاد کی حکمرانی ہے' انسانی سماج طرح طرح کی مشکلات' مسائل اور مصائب سے دوچار ہے ایک ایسے ہمہ گیر اور ہر شعبہ حیات پر محیط انقلاب کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو ایک نیا وجود عطا کرے۔ ان کی دنیوی اور اُخروی حیات کے تقاضے' ان کی مادی وروحانی ضروریات اور خالقِ کائنات سے ان کے تعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے مواقع' ماحول اور سامان فراہم کرے۔ تاکہ ان کی فطری خواہشات کی درست طریقے اور صحیح راستے سے تسکین ہو سکے اور ان کے مسائل ومشکلات رفع کئے جاسکیں۔

اسلامی تعلیمات کی رو سے ایسے ہمہ گیر انقلاب کی بنیاد ذہنی تبدیلی' معنوی تغیر اور فکری تبدل پر استوار ہے اسی بناء پر ہم ذہنی انقلاب کے موضوع کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے سارے اطراف وجوانب کی حتی الامکان وضاحت کی جاسکے۔

یہ انقلاب کیونکر وجود میں آسکتا ہے

"ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم"

"بے شک اللہ تعالیٰ تغیر و تبدل پیدا نہیں کرتا کسی قوم کے حالات میں جب تک وہ قوم خود اپنے اندرونی حالات اور ماحول میں تغیر پیدا نہ کرے۔" (سورہ رعد ۱۳ آیت ۱۱)

"ذالک بان اللہ لم یک مغیراً نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم"

"بتحقیق خداوندِ عالم کسی اس نعمت کو جو کسی قوم کو عطا کی ہے اس وقت تک سلب نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندرونی حالات اور اوضاع واحوال میں تغیر نہ کرلے۔" (سورہ انفال ۸ آیت ۵۳)

متذکرہ بالا آیات میں دو انقلابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان میں سے ایک کو دوسرے انقلاب کی بنیاد بتایا گیا ہے۔ یہ انقلابات ہیں۔

۱۔ اندرونی انقلاب۔

۲۔ بیرونی انقلاب۔

انفرادی اور اجتماعی سطح پر بیرونی انقلاب اسی صورت میں رونما ہو سکتا ہے جب اس میں اندرونی انقلاب اور نفسانی تبدیلی آچکی ہو۔ اندرونی انقلاب اور کسی فرد و معاشرہ کے باطنی تغیر سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفس اور قوۃ عاقلہ میں یہ تین بنیادی عناصر نمودار ہو جائیں۔

۱۔ فکر اور انداز فکر میں انقلاب

۲۔ تصورات اور مفاہیم میں انقلاب

۳۔ اور ارادہ میں استحکام

یہ عناصر بیرونی انقلاب کا نکتہ آغاز ہیں اور ان تبدیل شدہ افکار و تصورات کو عملی جامہ پہنانے اور معاشرہ پر لاگو کرنے اور ہمہ گیر انقلاب کے لئے منصوبہ بندی اور عزم و ارادہ کے ساتھ قدم اٹھایا جائے۔

یہ انقلاب کس قدر ہمہ گیر نتائج کا حامل ہو گا، کس قدر وسیع ہو گا اور کس کس شعبہ

ہائے زندگی کو اپنے دامن میں سمیٹنے کا باعث ہو گا یہ اس انقلاب کی قائد انقلابی جماعت کے اہداف ومقاصد اور وسعتِ فکر سے مربوط ہے۔ اسی معیار کو مدِ نظر رکھ کر اس انقلاب کے فرد اور معاشرہ کے لئے مفید یا مضر ہونے کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔

اندرونی تغیر اور پھر اس کے بعد بیرونی سطح پر انقلاب لانے کے قدرتی راستے اور عملی طریقے کا خاکہ وہی ہے جس کا تذکرہ مذکورہ صدر آیتِ شریفہ کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن اس وضاحت کے بعد مندرجہ ذیل سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ انقلاب کے حصول کے لئے مذکورہ ترتیب کے درمیان سبب اور مسبب اور علت و معلول کی نسبت کس طرح پیدا ہو گئی ہے؟

دوسرے یہ کہ خارجی تبدیلی داخلی تبدیلی پر کیوں کر موقوف ہے؟

ان سوالات کے جوابات تبدیلی کے بنیادی عناصر کی وضاحت اور ان پر تجزیہ و تحلیل کے بعد خود بخود مل جائیں گے۔

فکر و طرزِ فکر میں انقلاب، تصورات و مفاہیم میں انقلاب

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو چند امتیازات و خصوصیات کی بنا پر تمام مخلوقات پر ترجیح دی ہے اور اسے افضل و اشرف مخلوق کے لقب سے نوازا ہے۔

ان خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو غور و فکر، تدبّر و تفکر، فہم و فراست اور عقل کی بے نظیر دولت سے نوازا ہے۔

انسان کی قدرتِ فکر و عقل کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ وہ اس فکر و عقل کے ذریعہ کائنات کے انتہائی چھوٹے ذرے (ایٹم) تک اپنی حکومت قائم کر چکا ہے اور روز بروز سیاروں اور کہکشاؤں کو تسخیر کرنے میں مصروفِ عمل ہے۔

اگر یہ پر اسرار مخلوق انسان خود اپنے وجود، اس میں پنہاں اسرار و رموز اور اپنے فرائض وذمہ داریوں کا بغور جائزہ لے، خالقِ کائنات سے اپنے تعلق، بنی نوع انسان کے حوالے سے اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں اور اپنی اور اس کائنات کی تخلیق کی غرض وغایت کا صحیح ادراک کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ اس کی تخلیق اور دنیا میں آمد بے مقصد نہیں۔ بلکہ اس کی

تخلیق کے اولین روز سے ہی خلافت الٰہی کا بار گراں اس کے کاندھوں پر ہے چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

"انی جاعل فی الارض خلیفہ"

"بے شک میں زمین پر خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔" (سورہ بقرہ ۲ آیت نمبر۳۰)

یہ حس اور شعور بیدار ہوتے ہی انسان ان تمام برائیوں اور گمراہیوں سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے جو اس منصب کے منافی ہیں۔ اور وہ تمام راہیں اس کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جن پر چلے بغیر مذکورہ منصب کی ذمہ داری اور خلافت الہیہ کے تقاضے پورے نہیں کئے جاسکتے۔

خلافتِ الٰہی کے تقاضے ہر لمحہ انسان کو اپنے مالکِ حقیقی کی یاد دلاتے ہیں اور ہمیشہ اس کے قلب وذہن پر دستک دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے انسان! تو خدا کی ملکیت ہے' تیری زندگی کا ہر ہر پل اسی کی رضاجوئی کے لئے صرف ہونا چاہئے۔ اے انسان! تو عاجز وناتواں' ناقص اور نامکمل ہے۔ کامل اور بے نیاز ہستی خدا سے لو لگا' اس کے کامل اور بے نیاز وجود سے اپنے نقص اور نیاز کی تکمیل کا سامان فراہم کر۔

"یاایھاالناس انتم الفقرا الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید"

"اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو اور وہی اللہ بے نیاز اور قابل تعریف ہے۔" (سورہ فاطر ۳۵ آیت ۱۵)

"انا عرضنا الامانتہ علی السماوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا۔"

"بے شک ہم نے اس امانت کو آسمانوں کے اور زمین کے اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس بار کو اٹھالیا۔ یقیناً انسان بڑا ظالم اور نادان ہے" (سورہ احزاب ۳۳ آیت ۷۲)

"اے انسان! تو اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے اس عظیم ذمہ داری اور بڑے منصب کے تقاضوں کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام نہ لینا۔"

"اے انسان! تجھ سے عقل و شعور کا حامل ہونے' آزاد و خود مختار ہونے اور خلیفۂ خدا ہونے کی وجہ سے قیامت کے دن پوچھ گچھ کی جائے گی' تجھے جوابدہ ہونا ہے تیری ہر حرکت' ہر سکون اور تیری زندگی کے ہر لمحہ کا عدالتِ خداوندی میں حساب لیا جائے گا۔"

"وقفوھم انھم مسئولون"

"اور ان کو ٹھہرالو کہ ان سے سوالات کئے جائیں"

ہر معاشرہ کی ترقی اور تنزّل میں افرادِ معاشرہ کا کردار و عمل بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی انسان کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور اپنے معاشرہ سے لاتعلق رہے خلیفۂ الٰہی ہونے کے ناتے انسان کا پیدائشی فرض ہے کہ وہ معاشرہ کے ہر شعبہ میں ترقی اور تکامل کے لئے اپنی کوششیں بروئے کار لائے۔ اور یہ وہ ذمہ داری ہے جس کی بابت اس سے روزِ حشر سوال کیا جائے گا۔

"واتقوا فتنۃ لاتصیبن الذین ظلمو امنکم خاصۃ"

"اور اس فتنے (برے انجام) سے ڈرتے رہو جو خصوصیت کے ساتھ ان ہی لوگوں پر نہ پڑے گا جو تم میں سے ظالم ہیں۔" (سورۃ انفال ۸ آیت ۲۵)

"ولو ان اھل القری امنو او اتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض ولکن کزبوا فاخزناھم بما کانو ایکسبون"

"اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے جھٹلایا۔ پھر ہم نے بھی جیسی برائیاں وہ کیا کرتے تھے اس کے بموجب ان سے مواخذہ کیا۔" (سورہ اعراف ۷ آیت ۹۶)

والو استقاموا علی الطر یقۃ لا سقینھم ماء غدقا۔

"اور جو یہ سیدھے راستے پر قائم رہتے تو ہم ان کو بکثرت پانی سے سیراب کرتے" (سورہ جن ۷۲ آیت ۱۶)

غرض افکار کی تبدیلی کے باعث زندگی، تاریخ، کائنات نیز ان اہداف ومقاصد کے بارے میں نئے خیالات اور بلند سطح افکار جنم لیتے ہیں اور یوں انسان ذاتی رجحانات، انفرادی مفادات، مادہ پرستی، منصب ومقام کی خواہش جیسے روحانی سرطان اور اخلاقی امراض سے چھٹکارا حاصل کر کے خلقِ خدا کے فائدے، خداوند عالم کی جانب سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی اور بندگیٔ خدا کے اصولوں کے مطابق سوچنا، بولنا اور عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔

چنانچہ فکری طہارت کے زیر اثر کج فکری اور طرح طرح کے غلط مفاہیم صفحہ ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور اس کی جگہ قرآنی تعلیمات کے چشمہ زلال سے پاکیزہ افکار اور اعلیٰ مفاہیم کے برگ وبار پھلنے پھولنے لگتے ہیں۔

طرزِ فکر کی یہ تبدیلی انفردی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ذاتی اخلاق وکردار، معاشرتی تعلقات وروابط اور سماجی اوضاع واحوال کے حوالے سے انسانی فکر میں بنیادی تبدیلی نمودار ہوتی ہے۔

فکری انقلاب کے حامل خود شناس، خدا شناس اور فریضہ وذمہ داری کا احساس رکھنے والے یہ افراد کائنات، تاریخ اور مظاہر وعظمتِ خدا کے بارے میں عام افراد سے یکسر مختلف انداز فکر رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں ہر چیز درس وعبرت کا سامان ہے۔ یہ لوگ حالات کی دگرگونی اور زندگی کے تغیرات سے اپنے خیالات وتصورات میں نت نئی تبدیلیاں لاتے رہتے ہیں۔ اور کوئی سیاسی، سماجی اور اقتصادی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جس سے یہ لوگ فکری، عملی اور تبلیغی میدان میں کوئی فائدہ نہ اٹھاتے ہوں چنانچہ قرآن کریم اس ممتاز گروہ کی توصیف یوں کرتا ہے۔

"ان فی خلق السماوات والارض و اختلاف الیل و النهار لایات لاولی الالباب الذین یذکرون الله قیاما و قعودا و علی جنوبهم و یتفکرون فی خلق السماوات والارض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار۔"

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں ان صاحبانِ عقل کے لئے نشانیاں موجود ہیں جو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹوں کے بل (لیٹے لیٹے) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمان و زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار! تو نے ان کو فضول پیدا نہیں کیا تیری ذات پاک ہے پس تو ہم کو آتشِ جہنم سے بچا لے" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۹۰'۱۹۱)

اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سعدی شیرازی فرماتے ہیں۔

ابرباد و مہ و خورشید فلک درکارند
تاتوانی بکف آری و بہ غفلت نخوری

فکر و شعور میں انقلاب جذبات و احساسات میں بھی تبدیلی کا باعث بنتا ہے چنانچہ باہمی تعلقات' محبت و التفات میں اسلامی معیار و میزان اصل حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ان کا محور و مرکز بن جاتا ہے۔ پھر محبت و الفت اسی سے کی جاتی ہے جس سے محبت رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنے اور طاغوت و شیطان صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے نفرت و بیزاری کا برملا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور حیات بخش اسلامی نظام کی ترویج کے سلسلہ میں ذمہ داری کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے اور الٰہی پیغام کی دعوت اور تبلیغ کی بھاری ذمہ داری کی ادائیگی کا احساس ایک پل چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

ارادہ و عمل میں استحکام

اندرونی تبدیلی کے بنیادی عناصر میں سے دوسرا اہم عنصر ارادہ و عمل میں استحکام ہے۔ جب انسان میں فکری انقلاب نمودار ہوتا ہے تو نتیجہ کے طور پر ارادہ و عمل میں بھی استحکام پیدا ہو جاتا ہے جو اسے میدانِ عمل میں قدم رکھنے اور وہاں ثابت قدمی سے ڈٹے رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ پھر یہ انسان عزم بالجزم اور مصمم ارادے کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔

"انم المومنون الذین اذا ذکر اللہ و جلت قلوبھم و اذا تلیت علیھم ایاتہ زاد تھم ایمانا و علی ربھم یتو کلون۔"

"مومن تو صرف وہی ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل (اس کے جلال و عشق سے) دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں ان پر پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو بڑھا دیتی ہیں اور وہ صرف اپنے پروردگار ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔" (سورہ انفال ۸ آیت ۲)

امام جعفر صادق علیہ السلام مومن کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"ان المومن اشدمن زبر الحدیدان زبدالحدید اذا دخل النار تغیر و ان المومن لو قتل ثمہ نشر تھم ثمہ قتل لمہ یتغیر قلبہ"

"مومن لوہے سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے کیوں کہ اگر لوہا آگ میں ڈالا جائے تو وہ نرم پڑ جاتا ہے لیکن اگر مومن کو (راہ خدا میں) قتل کیا جائے اور پھر زندہ کیا جائے اور پھر قتل کیا جائے تو اس کے دل اور ایمان میں ذرہ برابر تزلزل نہیں آئے گا۔" (بحار الا نوار ج ۶۷ ص ۳۰۴۔ میزان الحکمہ ج ۱ ص ۳۳۸)

داعی اور مبلغ اتنے پختہ ارادے کا مالک ہوتا ہے کہ لوگوں کا توہین آمیز رویہ اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا اس کے عزم و استقلال میں ذرہ برابر کمی نہیں لاتا۔ بلکہ لوگوں کی نازیبا حرکات اور معاندانہ طرزِ عمل اس کے عقیدے، خیالات اور موقف میں مزید پختگی پیدا کر دیتا ہے اور اس کے اصول و نظریات، عقائد و افکار میں سرمو فرق واقع نہیں آتا۔

"الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ"

"جو لوگ خدا کا حکم پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتے۔" (سورہ احزاب ۳۳ آیت ۳۹)

"الذین استجابو اللہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم

لزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔"

"جنہوں نے زخم لگ جانے کے بعد بھی اللہ و رسولؐ کا حکم مان لیا ان میں سے جو نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے وہی تو ہیں جن سے آدمیوں نے کہا تھا کہ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑی طاقت جمع کی ہے لہٰذا ان سے ڈرو تو اس خبر نے ان کا ایمان اور بڑھا دیا اور انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ سب سے بہتر کارساز ہے۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۷۲، ۱۷۳)

یہ ایک قدرتی اور لازمی امر ہے کہ جب مبلغِ اسلامی اور داعیٔ دین معاشرتی اصلاح کے میدان میں قدم رکھتا ہے اور خم ٹھونک کر جاہلانہ رسوم و رواج اور انحرافی افکار کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے تو کبھی تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے اور کبھی اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اگر داعی و مبلغ محکم عزم و ارادے کا مالک ہو اور ساتھ ساتھ افکار و مقاصد میں گہرائی بھی رکھتا ہو تو ناکامی کبھی بھی اس کے حرکت و عمل میں کمی نہیں لاتی اور کسی بھی حال میں وہ اپنے مقصد سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔

اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اسلامی تحریک کے لئے کام کرنے والوں کی نظر میں ناکامی نام کا کوئی مفہوم نہیں بلکہ اس راہ میں انجام پانے والا ہر عمل قرینِ کامیابی ہوا کرتا ہے۔ بلکہ ایک مخلص داعی کی نظر میں ناکامی، کامیابی کا زینہ ہوتی ہے کیونکہ ناکامی اسے اپنے عمل پر تجدید نظر کا موقع فراہم کرتی ہے اور یوں وہ اپنے آئندہ کاموں کو سابقہ غلطیوں سے بچاتے ہوئے اور نئے تقاضوں کے مطابق کم سے کم غلطیوں کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انفرادی تبدیلی پھر معاشرتی انقلاب

بعض اوقات فکر و شعور میں رونما ہونے والی تبدیلی ایک فرد یا چند مخصوص افراد ہی تک محدود رہتی ہے اور اس کے اثرات معاشرہ پر مرتب نہیں ہو پاتے۔ اگر افرادِ معاشرہ کی غالب اکثریت اندرونی انقلاب کا مرحلہ طے کر چکی ہو تو یہ تبدیلی معاشرہ کی بیرونی سطح پر بھی نمودار

ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے بھی قوم وملت کے مجموعی حالات میں تغیر کے لئے یہی شرط رکھی ہے کہ "جب تک کسی قوم کے افراد خود اپنے میں تبدیلی اور انقلاب نہ لائیں اس وقت تک اس قوم کی حالت نہیں بدل سکتی" اور یہ سنت الٰہی ہے جس میں تبدیلی یا انکار کی کوئی راہ نہیں۔

البتہ معاشرہ میں مکمل انقلاب کا فطری طریقہ اور انبیاء کرام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ تبدیلی کا عمل پہلے فرد سے شروع کیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ انقلابی فکر رکھنے والے تربیت یافتہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہو جو معاشرہ میں ایک مکمل اور ہمہ گیر انقلاب پر منتج ہو گا۔ لہٰذا محولہ بالہ آیہ کریمہ میں دو تبدیلیوں کا ذکر ملتا ہے۔

اول۔۔ پورے معاشرہ میں ہمہ گیر اور مکمل انقلاب کا قیام۔

دوم۔۔ افراد معاشرہ کی فکر و عمل میں یکسر انقلاب۔

معاشرہ میں مکمل انقلاب اور ہر شعبۂ حیات میں یکسر تغیر کی بنیاد افرادِ معاشرہ کے کردار و عمل، افکار و نظریات میں تبدیلی کو قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں (یعنی انفرادی اور معاشرتی) تبدیلیوں کے درمیان علت و معلول کا سا تعلق ہے۔ لہٰذا اگر محض چند افرادِ معاشرہ میں فکری اور عملی تبدیلی رونما ہوئی ہو اور ظاہری و باطنی انقلاب صرف چند افراد تک محدود ہو اور پورا معاشرہ یا اس کی غالب اکثریت اس انقلاب اور تبدیلی سے محروم ہو تو مجموعی طور پر معاشرتی سطح پر اس انقلاب کے کوئی اثرات نظر نہ آئیں گے۔

ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی مکمل اصلاح اور حیات بخش انقلاب کی بنیادی اور اوّلین شرط ذہنی انقلاب اور افکار و نظریات میں تبدیلی ہے۔ پھر جیسا کہ آیۂ قرآنی کی روشنی میں ہم نے پہلے واضح کیا کہ کسی قوم کے حالات میں تبدیلی اس قوم کے افراد کے کردار سے وابستہ ہے۔ تو اگر کسی قوم کے افراد کے افکار و عمل فساد و انحراف پر مبنی ہوں اور اس نے ظلم و جور کی راہ کو اپنا لیا ہو تو لامحالہ یہ قوم اجتماعی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبہ میں پستی و انحطاط کا شکار ہو جائے گی۔ چنانچہ دور حاضر میں انسانیت کی تباہی اور قعرِ مذلت کی جانب اس کا سفر ہمارے دعوے کی روشن دلیل ہے۔

انقلابی عمل کے وسائل

انقلاب کی کامیابی کے لئے کیا وسائل درکار ہیں؟ باعبارتِ دیگر انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ کیا انقلاب تشدد، جبر، سختی اور طاقت کے استعمال سے برپا کیا جا سکتا ہے؟ یا مطلوبہ انقلاب کے لئے محض وعظ و نصیحت، افہام و تفہیم ہی کافی ہے؟ یا پھر انقلاب کے لئے دونوں طریقے اختیار کئے جائیں؟

اس وقت دنیا میں پائے جانے والے گوناگوں افکار و نظریات اپنے نکتہ نظر کی روشنی میں ان سوالات کے مختلف جواب دیتے ہیں۔ مگر ہم اختصار کے پیشِ نظر یہاں صرف چند اہم جوابات کے تذکرہ پر اکتفا کرتے ہوئے آخر میں اسلامی نکتہ نظر پیش کریں گے۔

مارکس کا نظریہ

کارل مارکس نے فلسفہ، اقتصاد، تاریخ اور سماج سے متعلق جو اپنا خاص زاویہ نگاہ پیش کیا اسے مارکسزم کہتے ہیں۔ اور اس نظریہ پر اعتقاد رکھنے والوں کو مارکسی۔

مارکس کے نزدیک اس کے پیش کردہ نظریات پر عمل ہی انسانیت کو درپیش تمام مسائل و مشکلات کا واحد حل ہے، کارل مارکس کے خیال میں سماجی نظام میں انقلاب کی واحد صورت یہ ہے کہ رائج نظام کے خلاف بغاوت کی جائے۔ یہ انقلاب صرف طاقت، شورش، تشدد اور تصادم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ یعنی مارکسی اصطلاح میں معاشرہ کے دو بنیادی طبقات بورژوای (سرمایہ دار) اور پرولتاری (مزدور، عوام الناس) میں ہمیشہ کشمکش اور نزاع جاری رہتی ہے۔ یہ مسلسل جنگ و جدال بورژوا کی شکست، اس کے خاتمہ اور پرولتا کے غلبہ اور فتح پر ختم ہوتا ہے۔ پرولتاریوں کی حاکمیت کے نتیجہ میں معاشرہ کے تمام شعبوں میں یکسر انقلاب بپا ہو جاتا ہے۔ غرض مارکس کی نظر میں اس قسم کا مسلح انقلاب اور غیر مفاہمانہ طرز عمل ہی انقلاب کا واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا راستہ لغو اور بے نتیجہ ہے۔

کارل مارکس کی حیات میں تو اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور وہ اپنے وضع کردہ نظامِ اشتمالیت کو حاکم نہ دیکھ سکا۔ لیکن اس کی موت کے بعد اس کے خیالات کی تفسیر و تاویل میں خود اس کے حامیوں اور پیروکاروں کے درمیان شدید اختلافات رونما ہو گئے اور یہ لوگ

دو گروہوں مشرقی مارکسزم اور مغربی مارکسزم کی صورت میں تقسیم ہو گئے۔

مشرقی دھڑا جس کی قیادت روس کے پاس تھی اس کا خیال یہی تھا کہ تبدیلی اور انقلاب کی واحد راہ مسلحانہ جدوجہد اور طاقت کا استعمال ہے۔ خود روس میں اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے شاہی حکومت کے خلاف انقلاب رونما ہوا اور آج بھی دنیا میں جہاں جہاں اس نظریہ کے ماننے والے موجود ہیں وہ وہاں کود تا اور کشت و خون کے ذریعہ رائج نظام کا خاتمہ کر کے اپنے خیالات و نظریات پر مبنی نظام قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

پارلیمانی نظام کے حامیوں کا نظریہ

معاشرہ میں انقلاب اور نظامِ حکومت میں تبدیلی کے طریقۂ کار کے بارے میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ خونی انقلاب' پر تشدد تحریک اور مسلحانہ طاقت و قوت کے اظہار کے بغیر بھی انقلاب بپا کیا جا سکتا ہے اور افہام و تفہیم' آزاد پارلیمانی بحث و مباحثہ اور تبلیغ و ترغیب کے ذریعہ بھی اجتماعی' سیاسی' معاشرتی' ثقافتی' اقتصادی اور معاشی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

یعنی اگر کسی گروہ کے نزدیک رائج نظامِ حکومت انسانی مشکلات و مسائل کے حل سے قاصر ہو تو اسے چاہئے کہ انسانی مسائل کے حل کے حوالہ سے اپنا پروگرام اور نکتۂ نظر ذرائع ابلاغِ عامہ جیسے اخبارات' رسائل ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ لوگوں کے سامنے پیش کرے' اپنے حق میں رائے عامہ ہموار کرے اور انتخابات کے موقع پر اس سے استفادہ کرتے ہوئے ایوانِ اقتدار تک رسائی حاصل کرے اور پھر اپنے افکار و نظریات کے مطابق نظامِ حکومت کی تشکیل کرے۔

اس نظریہ کے حامی زیادہ تر ان ممالک میں پائے جاتے ہیں جہاں آزاد سیاسی فضا اور انتخابی نظام قائم ہے نیز مغربی مارکسزم کے دھڑے بھی اس نظریہ پر یقین رکھتے ہیں اور مغربی یورپ میں اشتراکی نظام کے طرفدار مذکورہ آزاد فضا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نظریات کا بھرپور طریقے سے پرچار کرتے ہیں۔

اسلام کا نظریہ

اسلام ایک خاص انداز' بلند فکر و نظر اور اعلیٰ و ارفع مقصدِ حیات کا حامل دین ہونے کے

ناطے معاشرتی تغیر اور ہمہ گیر سماجی انقلاب کے وسائل وذرائع کا تعین بھی عقل و منطق اور شعور و حکمت کے اصولوں کے مطابق کرتا ہے۔ نہ ہی وہ اس تغیر کیلئے ہر موقع اور ہر حالت میں محض مسلحانہ اقدام اور تشدد و تصادم کو کافی و مناسب سمجھتا ہے اور نہ ہی اس کی نظر میں افہام و تفہیم اور تبلیغ و ترغیب ہمیشہ کارگر ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو موقع محل کی مناسبت سے ہر دو طریقوں سے استفادہ کی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے اس کے ماننے والے سیاسی حالات' معاشرتی ماحول اور خود اسلام کے اعلیٰ مصالح و مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کبھی ایک طریقہ اور کبھی دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ ذمہ داری داعی اور مبلغِ اسلام کی ہے کہ وہ دقتِ نظر کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ تبدیلی کے لئے استعمال کئے جانے والے ذرائع اور خود تبدیلی کے مقصد میں کس قدر مطابقت پائی جاتی ہے۔ اسے اس نکتے کو ہمیشہ مدِّ نظر رکھنا ہو گا کہ ہم اسلامی دعوت اور معاشرہ سازی کی مہم میں کس مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ افہام و تفہیم' تبلیغ و ترغیب' ہدایت و ارشاد اور نرم گفتاری و سکون کے ذریعہ ہم اپنے مقصد میں زیادہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں یا ---- طاقت و قوت اور تصادم و ٹکراؤ کا اسلوب زیادہ موثر' مفید اور سریع ثابت ہو گا۔ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ ہم کس قدر اور کس قسم کے وسائل و امکانات کے مالک ہیں۔ اگر ہم ٹکراؤ اور تصادم کی راہ اختیار کریں تو دشمن کا ردِّ عمل کیا ہو گا۔ اس ردِّ عمل کو ہم سہار بھی سکیں گے یا نہیں۔ آیا ہم بنیادی طور پر ابتدائی مرحلے میں بھی کسی خاص وسیلے سے تبدیلی لانے پر قادر ہیں یا نہیں۔

نرم و پر سکون اسلوبِ کار اس وقت انتہائی مناسب ہو گا جب میدان میں کوئی منظم معاند قوت موجود نہ ہو اور اسلام کی دعوت' نشر و اشاعت' بحث و مباحثے اور ہدایت و ارشاد ہی کے ذریعہ عام ہو رہی ہو۔ جبکہ اس کے برعکس شدت و سختی' طاقت و قدرت سے کام لینا اس وقت ضروری ہو گا جب دعوت کا میدان جنگ و جدال اور طاقت آزمائی کے مظاہرہ میں بدل چکا ہو۔

یہ اہم بات بھی پیشِ نظر رہے کہ تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں پائی جانے والی اسلامی

نصوص، آیات و روایات کے ذریعہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسلام تشدد و تصادم پر افہام و تفہیم اور دلائل و براہین کو ترجیح دیتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیشِ خدمت ہے۔

پہلی وجہ

اسلام دلیل و برہان، عقل و منطق کا دین ہے۔ اسلام نے اپنے تمام اصول خواہ وہ عقائد سے مربوط ہوں، اخلاق سے متعلق ہوں یا ایمان اور دیگر بنیادی امور سے تعلق رکھتے ہوں۔ سب کی بنیاد عقل، تفکر اور منطقی استدلال پر رکھی ہے۔ توحید سے لے کر نبوت و رسالت، معاد و قیامت، قرآن و کتاب غرض ہر چیز کی حقانیت کا دلیل و منطق کے ذریعہ ثبوت فراہم کیا ہے۔

قرآن کریم لوگوں سے ان کے منحرف عقائد و افکار کی حقانیت پر دلیل و برہان کے ذریعہ ثبوت طلب کرتا ہے۔ پھر کیوں کر ممکن ہے کہ خود اپنی دعوت کو عقلی و منطقی استدلال کے بجائے زور و زبردستی سے منوائے۔ قرآن کریم ہی میں داعیانِ حق کے لئے یہ ہدایات بھی ملتی ہیں کہ مخالفین کے سامنے اپنی دعوت کو عالمانہ مباحثہ اور دلیل و منطق کے ذریعہ پیش کریں۔

"ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن"

"تم اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ساتھ ان کو بلاؤ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو جو بہت ہی اچھا ہو"

(سورہ نحل ۱۶ آیت ۱۲۵)

"قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی"

"تم یہ کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور وہ جس نے میری پیروی کی ہے بصیرت پر ہیں" (سورہ یوسف ۱۲ آیت ۱۰۸)

".....قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین"

"تم کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو" (سورہ بقرہ ۲ آیت ۱۱۱)

"قل فاتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدی منھما اتبعہ ان کنتم صادقین"

"تم یہ کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو تم اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لاؤ جو (تورات و قرآن) دونوں سے زیادہ ہدایت کرنے والی ہو تاکہ میں اس کی پیروی کرنے لگوں" (سورہ قصص ۲۸ آیت ۴۹)

"و ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبد نا فا توا بسورۃ من مثلہ و ادعوا شھدائکم من دون اللہ ان کنتم صادقین"

"اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا اگر اس میں تمہیں کوئی شک ہو تو ویسی ہی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اگر تم سچے ہو تو خدا کے سوائے اور اپنے سب گواہوں کو بلا لو۔" (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۳)

"قل ارئیتم ما تدعون من دون اللہ ارونی ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرک فی السماوات ائتونی بکتاب من قبل ھذا او اثارۃ من علم ان کنتم صادقین"

"اے رسول! تم یہ کہہ دو کہ آیا تم نے غور بھی کیا کہ جن چیزوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کہ زمین سے انہوں نے کیا پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کوئی ساجھا ہے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب میرے پاس لے آؤ یا کسی علم کا بقیہ و آثار۔" (سورۃ احقاف ۴۶ آیت ۴)

"قل ھل من شرکا ئکم من یھدی الی الحق قل اللہ یھدی للحق افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی فمالکم کیف تحکمون۔"

"اے رسول! تم کہہ دو کہ تمہارے شرکاء میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی ہدایت کرے۔ تم یہ کہہ دو کہ اللہ حق تک پہنچاتا ہے۔ آیا وہ شخص جو حق تک پہنچا دے اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جس کو خود راستہ نہیں ملتا۔ جب تک کہ کوئی اور اس کو راستہ نہ بتلا دے پس تم کو کیا ہو گیا ہے یہ کیسا فیصلہ کرتے ہو؟" (سورہ یونس ۱۰ آیت ۳۵)

ان آیات کے علاوہ دیگر سینکڑوں آیاتِ کریمہ ہیں جو اپنے مدعا پر دلیل قائم کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں سے ان کے مدعا پر دلیل طلب کرتی ہیں۔

دوسری وجہ

انقلاب اور فکری تبدیلی کے عمل میں محض زبردستی (اکراہ) اجبار اور شدت و سختی کا طریقہ موثر و کارگر نہیں جب تک تبدیلی سے قبل یا اس کے بعد فکر و ذہن اس تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو اور یہ آمادگی افہام و تفہیم اور تبلیغ و ترغیب کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا قرآنی منطق میں دعوت کے موقع پر جبر و اکراہ کا اسلوب اختیار نہ کرنے کو فوقیت دی گئی ہے۔

"لا اکراہ فی الدین"

"دین میں کوئی زبردستی نہیں۔" (سورہ بقرہ ۲ آیت ۲۵۶)

"ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین۔"

"اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو زمین میں جتنے ہیں سب کے سب ایمان لے آتے پھر کیا تم لوگوں کو اس بات پر مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں۔" (سورہ یونس ۱۰ آیت ۹۹)

"وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بایۃ ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدی فلا تکونن من الجاھلین۔"

"اور اگر ان کا روگردان ہونا تم کو ایسا ہی ناگوار ہے تو اگر تم سے ہو سکتا ہے تو زمین میں کوئی سوراخ تلاش کرو یا آسمان پر کوئی سیڑھی (لگا کر چڑھ جاؤ) کہ ان کو کوئی نشانی لا دو اور اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جبراً آمادہ کرتا پس تم جاہلوں میں سے ہرگز نہ ہونا۔" (سورہ انعام ۶ آیت ۳۵)

"لیھلک من ھلک عن بیّنۃ ویحیی من حی عن بیّنۃ"

"تاکہ جو ہلاک ہونے والا ہے وہ حجت (و دلیل) سے ہلاک اور جو زندہ

رہنے والا ہے وہ بھی حجت (و دلیل) سے زندہ رہے۔" (سورہ انفال ۸ آیت ۴۲)

تیسری وجہ

کسی مذہب و مسلک اور نظریہ کی جانب سے دعوت کا طبیعی اور معقول طریقہ بحث و مناظرہ، گفت و شنید اور مذاکرہ و مباحثہ ہے، جسے ہر باشعور، بابصیرت اور عاقل شخص اپنا سکتا ہے۔ اس کے برعکس پر تشدد رویہ اور جبر و زبردستی کے ذریعہ دعوت ایک ایسا طریقہ ہے جسے انتہائی غیر معمولی حالات میں ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ کہ اس طریقے میں جو منفی پہلو پوشیدہ ہیں وہ پہلے طریقے یعنی افہام و تفہیم، بحث و مناظرہ اور گفت و شنید میں نہیں۔ اس بحث کو ہم مزید تفصیل کے ساتھ اسلوبِ عمل کے عنوان سے باب ششم میں پیش کریں گے۔

چوتھی وجہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنتِ مطہرہ بھی ہمارے اس دعوے پر شاہد ہے کہ جب تک حضورؐ جنگ پر مجبور نہ ہو جاتے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا اس وقت تک اس طریقہ کو اختیار نہ فرماتے۔

اسی طرح ائمہ علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ ہدایات نہایت وضاحت اور بڑی تاکید کے ساتھ ملتی ہیں کہ جنگ سے قبل فریقِ مخالف کے لئے دعوت و تبلیغ کا اہتمام کیا جائے اور دعوت مسترد ہو جانے کی صورت ہی میں جنگ کا آغاز کیا جائے۔ چنانچہ رسولِ مقبولؐ کی جانب سے سربراہانِ حکومت کو ارسال کئے جانے والے خطوط اور آغازِ جنگ کے موقع پر دیئے گئے آپؐ کے فرامین اس دعوے پر روشن دلیل ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کو یمن کی جانب بھیجتے ہوئے آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ۔

"یا علی لا تقاتلن احدا حتی تدعوہ الی الاسلام و ایم اللہ لئن یھدی اللہ عزوجل علی یدیک رجلا خیر لک مما طلعت علیہ الشمس و غربت۔"

"اے علیؑ کسی سے مت لڑنا جب تک اسے اسلام کی دعوت نہ دے لو۔

خدا کی قسم اگر تمہاری تعلیم وہدایت سے ایک شخص بھی ایمان لے آیا تو وہ تمہارے لئے ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن پر سورج اپنی روشنی ڈالتا ہے۔" (اصول کافی ج ۵ ص ۳۶۔ وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۳۳)

اس موقع پر سیاسی و عسکری صورتحال اور دعوتِ اسلامی کے ہر مرحلہ کا تقاضہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

شدت اور تصادم کا طریقۂ کار

دعوت کے پہلے اسلوب کی ناکامی یا اس کے مفید اور کارگر ثابت نہ ہونے کی صورت میں دوسرا طریقہ یعنی شدت اور طاقت کا استعمال بھی اسلام کی نگاہ میں نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض مواقع پر واجب ولازم بھی ہو جاتا ہے۔ ان مواقع کا مفصل جائزہ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

موردِ اوّل (اسلام کے تقدس کا دفاع)

اگر اسلامی مملکت اور اسلامی معاشرہ میں ایسے عناصر سرگرمِ عمل ہوں جن کا مقصد اسلام اور مقدساتِ اسلام کی توہین اور احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی ہو۔ تو اسلام کے دو ابدی اصولوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روشنی میں دوسرے ذرائع کامیاب نہ ہونے کی صورت میں طاقت کے ذریعہ ان مفسدات کا سدباب اور ان کے انجام دینے والے عناصر کا خاتمہ ضروری ہے۔ اور اگر اس فریضہ کی ادائیگی قتلِ نفس پر منحصر ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ (الجواہر ج ۲۱ ص ۳۸۲۔ النہایہ ص ۳۰۰۔ شرح لمعہ ج ۲ ص ۴۱۲۔ شرائع اسلام ج ۱ ص ۳۹۶۔ التشریع الجنائی الاسلامی ج ۱ ص ۵۰۸)

البتہ یہ ایک دوسری بات ہے کہ قتلِ نفس اور تلفِ اموال کی نوبت آنے کی صورت میں حاکمِ اسلامی کی اجازت ضروری ہے یا نہیں۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی از منکر کے تین مراحل میں سے ایک "استعمالِ ید" یعنی قوت و طاقت کا استعمال ہے۔ (وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۴۰۵)

موردِ دوّم (جابر حاکم کے خلاف)

اگر ایک ظالم و جابر حکمراں مسلمانوں پر مسلط ہو' ان کے سیاہ و سفید کا مالک ہو اور ان کے جان و مال پر حکمِ خدا کے بدلے خود اپنی مرضی و منشا کے مطابق حکومت کر رہا ہو۔ تو ہر مسلمان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اسے مسندِ اقتدار سے محروم کرنے کی سعی کرے اور احکام و فرامینِ الٰہی کے مطابق اپنے لئے خود حاکم کا تعین کرے۔ خواہ اس مقصد کے لئے اسلحہ کا استعمال اور خونی انقلاب ہی کیوں نہ برپا کرنا پڑے۔

چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے جد بزرگوار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ۔

"من رائی سلطانا جائر مستحلا لحرام اللہ ناکثا عھدہ مخالفا لسنتہ رسول اللہ یعمل فی عباد اللہ بالا ثم والعدوان فلم یغیر علیہ بفعل ولا قول کان لقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ"

"جس نے ایسے حاکم کو دیکھا جو ظالم ہو' حرامِ خدا کو حلال کرنے والا' اس کے عہد و پیمان کو توڑنے والا' سنتِ رسولِ خداؐ کی مخالفت کرنے والا اور بندگانِ خدا (اور معاشرہ) کے درمیان گناہ و ظلم کا ارتکاب کرنے والا ہو تو اگر وہ اس کی تبدیلی کے لئے قول و فعل سے حرکت نہ کرے تو خدا حق رکھتا ہے کہ اسے بھی اس ظالم کے ساتھ داخلِ جہنم کرے۔" (سخنان حسین ابن علی علیہ السلام ص ۱۴۹۔ وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۲۰)

موردِ سوّم (خارجی دشمن سے مقابلہ)

اگر کوئی بیرونی دشمن اسلامی سلطنت یا مسلمانوں پر حملہ آور ہو یا حملہ کی تیاریوں میں مشغول ہو تو مسلمان اپنے جان و مال کے دفاع کی خاطر دفاعی جہاد یا حملہ کا حق رکھتے ہیں اور اسلامی سربراہ یا مدافعینِ اسلام فوجی نکتہ نظر سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دشمن کے حملہ سے قبل ہی اس پر ایسی کاری ضرب لگائیں جس سے وہ مفلوج ہو جائے اور پیکر اسلام کو نقصان پہنچانے کے قابل نہ رہے۔

"یا ایھا الذین امنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار ولیجدوا فیکم غلظتہ و اعلموا ان اللہ مع المتقین۔"

"اے ایمان لانے والو کفار میں سے جو تمہارے آس پاس ہیں ان سے لڑتے رہو اور ضروری ہے کہ وہ تم میں سختی محسوس کریں اور یہ جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔" (سورہ توبہ ۹ آیت ۱۲۳)

دراصل مذکورہ تینوں موارد دفاعی جہاد کے ضمن میں آتے ہیں۔ اگرچہ بعض فقہائے اسلام ان میں سے پہلے اور دوسرے مورد کو امر بالمعروف اور صرف تیسرے کو دفاع کا نام دیتے ہیں۔

موردِ چہارم

جہاد الدعوۃ کے شرائط پائے جانے کی صورت میں جنگ و جہاد کا جواز فراہم ہوتا ہے۔ بسا اوقات اسلام کی حاکمیت کے قیام اور نظامِ اسلام کے نفاذ کی خاطر مسلحانہ جہاد لازم و ضروری بھی ہوجاتا ہے۔ باالفاظ دیگر اگر حالات ایسا رخ اختیار کریں کہ پیغام' دعوت الی اللہ اور انسانیت کے اسلام کی فیوض و برکات سے مستفیض ہونے کی راہ میں اس قدر رکاوٹیں کھڑی کردی جائیں کہ ان کا سد باب صرف مسلح اقدام ہی سے ممکن ہو تو ایسی صورت میں اسلام آخری حل کے طور پر مسلح جہاد کی اجازت دیتا ہے۔

جہادِ ابتدائی بھی دراصل اسلام کے دفاع' اس کی بقاء اور اس کے دوام کا ایک ذریعہ ہے۔

"واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدواللہ وعدوکم وٰاخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم○"

"اور جو قوت تم بہم پہنچا سکتے ہو اور جتنے گھوڑے تم سرحد پر بندھے رکھ سکتے ہو ان کی تیاری رکھو۔ تم ایسا کرنے سے دشمنِ خدا اور اپنے دشمن کو اور ان کے سوا لوگوں کو ڈراتے رہو گے تم ان کو نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔" (سورۃ انفال ۸ آیت ۶۰)

تبلیغ و دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں حضرت ختمی مرتبتؐ کا طریقِ کار بھی یہی تھا۔ مکی دور ہو یا مدنی' جب تک دعوت پہنچانے کے تمام دروازے بند نہ کردئے جاتے اور مسلح جہاد کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہتا اس وقت تک آپؐ جنگ وقتال سے گریز فرماتے۔ اور یہی وہ اسلوب ہے جس کا اسلام اپنے تمام ماننے والوں سے ہر دور میں متقاضی ہے۔

خلاصہ کلام

اسلام کی جانب دعوت ' اس کی تبلیغ و نفاذ اور اسلامی تعلیمات پر مبنی معاشرہ کے قیام کے لئے اسلام ہمیشہ صرف کسی ایک ہی طریقہ کار کو اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ سیاسی' اقتصادی' معاشی' معاشرتی' ثقافتی حالات اور عسکری صورتحال نیز انقلابی گروہ کے وسائل و امکانات پر منحصر ہے کہ انقلاب کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے۔

اندرونی انقلاب کی حد اور مقدارِ ضرورت

اسلامی انقلاب کے داعی اور معاشرہ میں ہمہ گیر انقلاب کا مدعا رکھنے والے افراد سے اب یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اجتماعی انقلاب اور خارجی سطح پر تبدیلیوں کے آغاز سے قبل اخلاقی' فکری' اور نظریاتی یعنی اندرونی تبدیلی ضروری ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اندرونی تبدیلی کی حد اور مقدارِ ضرورت کیا ہے؟ آیا معاشرہ کے تمام افراد جب تک اندرونی تبدیلی سے متصف نہ ہوں بیرونی انقلاب ممکن نہیں؟

اس سوال کے جواب سے قبل مقدمہ کے طور پر درجِ ذیل نکات پیشِ خدمت ہیں۔

★ یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض افرادِ معاشرہ انقلاب کے حق میں اس لئے نہ ہوں گے کہ اس کی وجہ سے ان کے ذاتی و انفرادی منافع اور طبقاتی ونسلی مفادات خطرات سے دوچار ہوجائیں گے۔

★ دورِ حاضر میں نظامِ مملکت چلانے کے انداز' حکومت کے مختلف شعبہ اور اس کے اداروں کی فنی پیچیدگیاں اس قدر زیادہ ہوچکی ہیں کہ جب تک اس نظام کے ہر شعبہ

میں ماہر افراد میّسر نہ ہوں اس وقت تک ہمہ گیر انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

★ نظامِ اسلام کی خاص نوعیت اس کے مخصوص عقائد' ممتاز مزاج اور منفرد نظریات و تصورات کی بناء پر اس نظام کو چلانے کے واسطے ایسے تربیت یافتہ افراد درکار ہیں جن کے افکار و نظریات اخلاق و کردار اور سلوک و رفتار اسلامی تعلیمات کی بنیادوں پر استوار ہوں اور وہ مکمل طور پر اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل چکے ہوں۔

لہٰذا ان نکات کو سامنے رکھتے ہوئے ذہنی انقلاب کی حد اور تربیت یافتہ افراد کی تعداد کا تعین اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ۔

ہر میدان اور شعبۂ حیات میں ماہرین کا ایک ایسا گروہ موجود ہو جو اسلامی اصول و نظریات کی روشنی میں فکری تربیت' ذہنی تبدیلی اور اخلاقی و روحانی انقلاب کا مالک ہو۔ اور جو ایثار و قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے سے سرشار ہو تاکہ رائج نظام کے دگرگوں ہوجانے کے بعد اس کی جگہ سیاسی' سماجی' ثقافتی' تعلیمی' معاشرتی' معاشی' اقتصادی' عسکری غرض ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات پر مبنی مکمل نظام کی تدوین کرنے کے بعد اس کے نفاذ پر بھی قادر ہو۔

نیز اس نظام کے کار پردازوں میں اس قدر لیاقت ہو کہ دنیا میں رائج دیگر نظاموں' اسلام دشمن عناصر اور کفار کے سامنے اپنی فکری' ذہنی اور عسکری صلاحیتوں کا لوہا منوا سکیں' سکا جما سکیں۔

اس کے علاوہ عوام الناس میں بھی ایسے انقلابی افراد کی معتدبہ تعداد آمادہ ہو جو بوقت ضرورت اس نظام کی حفاظت اور پشت پناہی کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ دینے سے بھی گریز نہ کریں۔

مذکورہ بالا ضروریات اس بات کی متقاضی ہیں کہ معاشرہ کی غالب اکثریت انقلاب کے لئے تیار اور اس کی ہمنوا ہو۔ یعنی سماج میں موجود افراد کی اکثریت اندرونی تبدیلی سے متصف ہوچکی ہو۔ ایسی صورت میں کچھ افراد کی مخالفت کوئی وزن نہیں رکھتی اور

وہ اس عظیم اکثریت کی منشاء کے خلاف انقلاب کی مخالفت میں کوئی عمل انجام دینے پر قادر نہیں ہوسکتے۔

چنانچہ اگر ہم دنیا میں رونما ہونے والے انقلابات پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی غالب اکثریت اپنے اوپر حکم فرما نظام سے برگشتہ ہو کر نئے نظام کی خواہش مند تھی۔

☆—☆—☆

باب چہارم

انفرادی عمل یا گروہی عمل

عمل کی دوسری تقسیم دو حصوں میں کی جاسکتی ہے۔

۱ انفرادی عمل

۲ گروہی عمل

ہر خطہ اور ہر دور میں تبلیغ اور دعوت کے لئے انہی دو میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کیا جاتا ہے۔

مختلف ممالکِ اسلامیہ میں اسلامی انقلاب اور دعوتِ اسلامی کے لئے سرگرمِ عمل قوتوں میں یہ ایک متنازع مسئلہ رہا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے انفرادی اور گروہی طریقوں میں سے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بعض افراد انفرادی عمل کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک گروہی عمل بہتر ہے۔

بسا اوقات انفرادی عمل کے قائل افراد اسے اس لئے پسند کرتے ہیں کہ انہوں نے در حقیقت گروہی عمل کی ضرورت اور اس کے فوائد سے متعلق غور و فکر نہیں کیا ہوتا اور انفرادی عمل کیونکہ زندگی کے ایک معمول کی صورت میں انجام پاتا رہتا ہے اس لئے وہ اسی راہ پر گامزن رہنا چاہتے ہیں۔

بعض افراد اصولی طور پر تو گروہی عمل کے مخالف نہیں ہوتے ۔ بلکہ اس کی ضرورت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد کے معترف ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر اسے اس لئے مسترد کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں اس کے منفی پہلو زیادہ ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس دور میں انفرادی عمل تقریباً بے فائدہ ہے۔ ان لوگوں کا اصرار ہے کہ اسلام' دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری عائد کرتا ہے اسے گروہی عمل کے ذریعہ زیادہ مفید اور موثر طریقے سے انجام دیا جاسکتا ہے۔ اور انفرادی عمل تضیع اوقات کے مترادف ہے جو انسان کی فکری اور عملی قوتوں کے بے جا مصرف کا موجب ہے۔ انفرادی عمل سے قلیل مدتی اور محدود فوائد تو حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن معاشرہ کی ہمہ گیر اصلاح اور ایک گہرا اور مکمل اسلامی انقلاب اس عمل کے ذریعہ بپا نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارا موقف

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا اسالیب میں سے کوئی بھی اسلوب مکمل طور پر درست اور عیوب و نقائص و معائب سے مبرا نہیں۔ ممکن ہے کسی میں نقائص کم ہوں اور کسی میں زیادہ' اور اسی طرح کسی کی خوبیاں زیادہ ہوں اور کسی کی کم۔

مذکورہ اسالیب میں سے کسی کا انتخاب معاشرتی ماحول اور زمانہ کے تقاضوں پر موقوف ہے۔ دعوت و تبلیغ کے آغاز کے وقت جائزہ لینا ہو گا کہ انفرادی عمل کا اسلوب اختیار کیا جائے یا گروہی عمل موزوں ہے۔ ایک خطہ ارض اور مملکت کے حالات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لہٰذا ایک ملک میں انفرادی عمل اور دوسرے میں گروہی عمل کامیاب اور بار آور ثابت ہوتا ہے۔ انفرادی عمل کا اسلوب اس علاقے میں بے سود ثابت ہو گا جہاں کے حالات' ماحول اور لوگوں کی نفسیات صرف گروہی عمل کے متقاضی ہوں۔ اسی طرح گروہی عمل اس علاقہ میں تباہ کن نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جہاں اس کے لئے حالات سازگار نہ ہوں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ صرف کسی ایک طریقہ کار و اسلوب کو علی الاطلاق ترجیح دینا قرین

عقل و منطق نہیں ــ بلکہ مبلغ اسلام اور داعیٔ دین کو چاہئے کہ معاشرتی ماحول' زمانہ کے تقاضوں اور لوگوں کی نفسیات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایسے اسلوب کو اختیار کرے جو کم سے کم خامیوں کا حامل اور زیادہ سے زیادہ فوائد و ثمرات لئے ہوئے ہو۔

ذیل کی سطور میں ہم ان دونوں اسالیب کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا حتی المقدور جائزہ لیتے ہیں تاکہ ایک داعی کو وقت و حالات کے مطابق ان کے انتخاب میں سہولت رہے۔

انفرادی عمل کے مثبت اور گروہی عمل کے منفی پہلو

★ گروہی عمل میں ایک خاص نظم و قانون کا پابند ہونے کی بنا پر وہ آزادی و حریتِ ارادہ میسر نہیں جو انفرادی عمل میں مکمل طور پر ملتا ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے داعی میں اطمینان اور اعتمادِ نفس کی ایک ایسی خاص کیفیت پائی جاتی ہے جس کا گروہی عمل میں فقدان ہے۔

★ انفرادی عمل میں اچانک رونما ہونے والے حادثات اور یکایک تغیر پا جانے والے سیاسی' سماجی اور مذہبی مسائل میں فوری طور پر کوئی نہ کوئی موقف اختیار کیا جاسکتا ہے اس کے برعکس گروہی عمل میں اس طرح بغیر صلح و مشورہ کے کوئی موقف اختیار کرنا گروہی عمل کے تقاضوں کے منافی ہے۔ لہٰذا بعض اوقات صلاح و مشورہ میں ہونے والی غیر ضروری تاخیر کے منفی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔

★ گروہی عمل انفرادی عمل کی بہ نسبت زیادہ پر خطر ہے۔

★ گروہی عمل کے دوران مادی اور فکری وسائل وذرائع اور لوازمات نہایت کم میسر ہوتے ہیں۔

★ گروہی عمل میں نا تجربہ کاری بعض اوقات بہت زیادہ نقصان کا موجب بنتی ہے۔

★ گروہی عمل کے لئے بڑی تعداد میں ہم فکر اور ہم خیال افراد کا اکھٹا ہونا ایک مشکل اور وقت طلب کام ہے۔

★ گروہی عمل میں مختلف نظریات و خیالات کے حامل افراد شامل ہونے کی وجہ سے

آپس میں اختلاف و تفرقہ بازی اور دھڑے بندی کے بہت زیادہ امکانات پائے جاتے ہیں اور دیکھنے میں آیا ہے کہ بسا اوقات یہی اختلافات اور دھڑے بندیاں امتِ اسلامیہ کی تباہی کا سبب بنتی ہیں ۔

★ گروہی عمل بذاتِ خود امتِ اسلامیہ میں بڑے پیمانے پر دھڑے بندیوں کا موجب ہوتا ہے ۔ کیونکہ ممکن ہے اجتماعی عمل کے لئے ایک سے زیادہ گروہ مختلف خطوط پر سرگرم عمل ہوں اور ہر ایک اپنے اپنے گروہ کی تائید و حمایت کرتے ہوئے دوسروں کی مخالفت کرے اور پھر رفتہ رفتہ یہی مخالفت تصادم کی صورت اختیار کرجائے۔

گروہی عمل کے مثبت اور انفرادی عمل کے منفی پہلو

★ گروہی عمل میں مختلف امور باہمی صلاح و مشورہ سے انجام پاتے ہیں اس لئے ان میں غلطی کا بہت کم امکان پایا جاتا ہے جب کہ انفرادی عمل میں تبادلۂ خیال کے فقدان کی وجہ سے غلطیوں کا بہت زیادہ امکان موجود ہے ۔

★ گروہی عمل میں ایک طرف تو باہمی تبادلۂ خیال کا اہتمام ہوتا ہے اور دوسرے ہر شخص کو کچھ خاص کام تفویض کئے جاتے ہیں ، جن کی انجام دہی کے لئے اسے جواب دہ ہونا پڑتا ہے ۔ لہٰذا تبادلۂ خیال اور محاسبہ و مواخذہ عمل کی رفتار کو تیز کرنے اور اسے بلاتوقف جاری رکھنے میں موثر ثابت ہوتا ہے ۔

اس کے برعکس انفردی عمل میں ان دونوں عناصر کے فقدان کی بناء پر یہ امکان اپنی جگہ موجود رہتا ہے کہ کبھی مبلغِ اسلام پر سستی اور اضمحلال کی کیفیت طاری ہو جائے۔

★ گروہی عمل ایک وسیع تنظیم کے ذریعہ انجام دیئے جانے کی وجہ سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ مطلوبہ نتائج تک رسائی بھی جلد ازجلد ہوجاتی ہے۔ مگر انفرادی عمل نہ ہی سریع ہو پاتا ہے اور نہ ہی وسیع حلقوں میں موثر۔ کیونکہ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ایک فرد کا عمل کتنا ہی موثر کیوں نہ ہو پھر بھی ایک گروہ اور جماعت کے عمل کے مقابلہ میں نہایت کم اثر ہوتا ہے ۔

★ انفرادی عمل کا سرچشمہ ایک فرد ہوتا ہے لہٰذا بالعموم سماجی، سیاسی اور تبلیغی منصوبہ

بندی سے مربوط مسائل میں نہ ہی گہرے' وسیع النظر اور دوررس فیصلے کئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی وسیع اقدامات عمل میں لائے جاسکتے ہیں ۔ جب کہ گروہی عمل میں صلاح ومشورہ اور باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعے دوررس اور گہرے فیصلے کئے جاسکتے ہیں اور تنظیمی قوت بروئے کار لاکر ان فیصلوں پر موثر عمل درآمد کیا جاسکتا ہے۔

★ انفرادی عمل میں ایک بے انتہا اھم اور بنیادی چیز کے فقدان کا احساس بالخصوص ہر داعیٔ اسلام اور بالعموم ہر فردِ مسلمان کر سکتا ہے اور وہ ہے اس اسلوب کے ذریعے ملت اسلامیہ کی ایک بڑی تعداد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور ان میں سے باصلاحیت عناصر کو اسلامی آئین اور قرآنی تعلیمات کے مطابق تربیت دینا۔

جب کہ گروہی عمل کے ذریعے امت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے' اس کے مسائل و مصائب کے حل کے لئے منصوبہ بندی کرنے' اسے اسلامی معارف و نظریات سے روشناس کرنے اور پھر ان میں سے باصلاحیت 'باکردار اور فعال عناصر کو چن کر اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت' اسلامی وطن کے دفاع' تبلیغِ دین کے فریضے اور ہمہ گیر اسلامی انقلاب کے قیام کے لئے ان کی خاص تربیت کرنے کے کافی مواقع فراھم کئے جاسکتے ہیں۔

★ ہمیشہ ہی سے اسلام کے خلاف طرح طرح کے الزامات اور نت نئے اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا ہے اور آج تک منظّم طور پر یہ سلسلہ جاری ہے ۔ اس ناکام مساعی میں وہ تمام افراد و عناصر 'منظّم اور غیر منظّم گروہ شریک ہیں جو اسلام کو ختم کرنے اور اس کے حقیقی چہرے کو مسخ کرنے کے درپے ہیں ۔

یہ اسلام دشمن عناصر کبھی ممالکِ اسلامیہ کے باہر سے اور کبھی خود اسلامی ممالک کے اندر منظّم گروہ کی صورت میں اور کبھی انفرادی سطح پر' کبھی الحادی افکار اور مادی نظریات کی حامل حکومتوں کی شکل میں اور کبھی سیاسی جماعتوں اور سیاسی تنظیموں کی صورت میں مسلسل اسلامی تعلیمات کو بے وزن 'ناقابلِ عمل اور ناقص ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف ہیں ۔ ان کی جانب سے اٹھائے جانے والے اعتراضات

اسلام کے کسی ایک خاص پہلو تک محدود نہیں ہوتے' بلکہ یہ عناصر پورے اسلام اور اس کے تمام ابعاد و جوانب کو گاہے بگاہے اپنی تنقید و اعتراضات کا نشانہ بناتے رہتے ہیں ۔ ان کے اتہامات اسلامی تعلیمات کے کسی خاص پہلو تک منحصر نہیں بلکہ اسلام کی اخلاقی'اعتقادی' فقہی' سیاسی' اقتصادی' معاشی اور معاشرتی تعلیمات غرض ہر شعبۂ حیات میں اسلامی تعلیمات ان کی تنقید کا ہدف ہیں۔

لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ ایک فرد خواہ وہ کتنا ہی باصلاحیت' فعال'اور صاحبِ بصیرت ہو ہر میدان میں مخالفینِ اسلام کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے پاس ایک گروہ کے مقابلہ میں فکری و عملی صلاحیتیں اور مادی امکانات ووسائل نہایت محدود ہوتے ہیں جب کہ اسلام دشمن قوتیں بے پناہ وسائل و امکانات کی حامل ہیں ۔

صرف گروہی عمل ہی مخالفین کی ریشہ دوانیوں کا تدارک کرسکتا ہے اور اس کے ذریعہ ان کے ہر اعتراض کا دندان شکن جواب دیا جا سکتا ہے اور ہر میدان میں ان کے دانت کھٹے کئے جاسکتے ہیں۔کیونکہ گروہی عمل کے تحت ایک خاص منصوبہ بندی کے ذریعہ ایسے متعدد افراد تیار کئے جاسکتے ہیں جو مختلف میدانوں میں اسلام دشمن قوتوں کے اعتراضات کے مستدل اور شافی جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں پھر گروہی عمل میں وسائل و ذرائع بھی کافی فراہم کئے جاسکتے ہیں۔

☆ عصرِ حاضر میں گروہی عمل حصولِ مقصد کے لئے ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمل ایک پنتھ دو کاج کا مصداق ہے۔ ایک طرف تو یہ دشمنوں کو مغلوب کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور دوسری جانب اس سے اہداف و مقاصد تک جلد رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہے کہ منظّم گروہی عمل کے مقابلے میں غیر منظّم اور انفرادی عمل کبھی نہیں ٹھہر سکتا ہرچند یہ عمل حق ہی کے لئے کیوں نہ انجام دیا جارہا ہو' لہٰذا منظّم عمل کا جواب اس سے بہتر منظّم عمل کے ذریعہ دیا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ منظّم اور بھرپور جواب گروہی عمل ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

دشمنانِ اسلام روز بروز نئے نئے طریقوں اور جدید ہتھیار و وسائل کے ساتھ فکری اور مادی میدانوں میں سرگرمِ عمل ہیں ۔ لہٰذا ان سے مقابلے کے لئے ہمیں بھی دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق فکری اور مادی وسائل و ذرائع کی فراہمی پر توجہ دینی چاہئے اور گروہی عمل ان وسائل میں سے ایک ہے ۔

"واعدوالهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم"

"اور جو قوت تم بہم پہنچاسکتے ہو اور جتنے گھوڑے تم سرحدوں پر بندھے رکھ سکتے ہو۔ ان کو تیار رکھو۔ ایسا کرنے سے تم خدا کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراتے رہو گے۔" (سورہ انفال ۸ آیت ۶۰)

★ اسلامی نصوص کا مطالعہ بھی اسی بات کو واضح کرتا ہے کہ گروہی عمل اسلام کی جانب سے عائد کردہ فرائض اور احکام کی روح سے زیادہ نزدیک ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں عموماً مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی خطاب کیا گیا ہے۔اگرچہ علماء اصول کے تجزیہ کے مطابق مجموعی خطاب کا بالآخر ہر فرد پر اطلاق ہوتا ہے مگر اس بحث کا لب لباب بھی یہی ہے کہ فرد مجموعی عنوان میں شامل ہونے کی وجہ سے اس خطاب کا مصداق بن جاتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

"ولتكن منكم امة يدعون الى الخير و يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و اولئك هم المفلحون۔"

"اور لازم ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے منع کریں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۰۴)

"كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر۔"

"تم بہترین امت ہو (اور تمھاری افضلیت اس بنا پر ہے کہ) نکالے گئے ہو لوگوں کی بھلائی کے لئے۔ تم لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرتے اور برے کاموں سے روکتے ہو۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۱۰)

★ اسلام کا مزاج اور اس کا ہمہ گیر پہلو بذات خود اس بات کا متقاضی ہیں کہ اسلامی تعلیمات سے مکمل طور پر آشنا افراد ہی اسلامی اصول و نظریات پر مبنی ہمہ گیر انقلاب بپا کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک ناممکن سا امر ہے کہ ایک فرد یا چند افراد اپنی ذاتی و انفرادی کوششوں سے اسلام کی گوناگوں تعلیمات کو درک کر سکیں نیز معاشرہ کو بھی ان سے روشناس کرا سکیں۔ لہٰذا لا محالہ افراد کی ایک ایسی بڑی تعداد کی تیاری کی ضرورت ہے جو ہر شعبۂ حیات سے متعلق اسلامی تعلیمات کا علم رکھتے ہوں اور ان شعبوں میں اسلامی اصول و نظریات کی تطبیق کر سکنے کے اہل ہوں اور یہ مقصد بغیر منصوبہ بندی اور اجتماعی و گروہی جدوجہد کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر انقلابی عمل محض عوامی حمایت سے آگے بڑھے تو اس حمایت کو قائم و دائم رکھنے میں مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ پھر دور حاضر میں تبلیغ کا کام اس قدر سخت اور مشکل صورت اختیار کر گیا ہے کہ اسے گروہی عمل اور تنظیمی قوت کے بغیر انجام دینا تقریباً ناممکن ہے۔

★ خود پیغمبرِ اکرمؐ کا اندازِ دعوت بھی گروہی طرز لئے ہوئے تھا۔ چنانچہ دعوتِ اسلامی کے آغاز میں تمام مسلمان پیغمبر اکرمؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خفیہ طور پر دار ارقم میں جمع ہوتے تھے۔ قرآنی تعلیمات اور آیاتِ الٰہی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی تبلیغ کا درس بھی حاصل کرتے تھے اور تبلیغی زندگی میں پیش آنے والے مسائل و مشکلات بیان کر کے ان کے حل بھی تلاش کرتے تھے۔

خلاصۂ کلام

انفرادی عمل اگرچہ بذاتِ خود بہت سے مثبت پہلوؤں کا حامل ہے مگر اس میں گروہی عمل کی بہ نسبت منفی پہلو زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پھر دورِ حاضر میں گروہی عمل ایک لازمی ضرورت ہے تاکہ موجودہ فاسد، منحرف اور غیر اسلامی معاشرہ کو صحیح راستے پر

لایا جا سکے اور اندرونی انقلاب اور ہمہ گیر تبدیلی سرعت کے ساتھ رونما ہو سکے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اگر معاشرہ میں نفاذِ اسلام صرف گروہی عمل پر ہی موقوف ہو جائے تو گروہی عمل کا انتخاب شرعی نکتہ نظر سے بھی واجب ہو جاتا ہے۔

گروہی عمل کا اس قدر خوبیوں اور مثبت پہلوؤں کا حامل ہونے کے باوجود ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انفرادی عمل بے قدرو قیمت ہے۔ لہٰذا گروہی عمل کے مواقع میسر نہ ہونے کی صورت میں انفرادی عمل کو مسترد کرنا اور اسے نہ اپنانا ہرگز مستحسن نہیں۔

گروہی عمل کے لئے حالات سازگار نہ ہونے کی صورت میں ہر فردِ مسلم کا فرض ہے کہ وہ اپنی شرعی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے تبلیغِ دین اور انقلابِ اسلامی کے لئے خواہ انفرادی شکل ہی میں کیوں نہ ہو جدو جہد کرے۔

انفرادی عمل درحقیقت گروہی عمل کا پہلا زینہ اور معاشرہ میں مکمل تبدیلی لانے کا اوّلین سنگ میل ہے۔ انفرادی عمل کے ذریعہ شرعی فریضے کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ میدانِ عمل سے حاصل ہونے والے تجربات مستقبل میں گروہی عمل کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

گروہی اور انفرادی عمل کے حوالہ سے ہم نے جو بحث کی اور دونوں کے فوائد و نقائص کا تذکرہ کیا اس کے بعد ان میں سے انتخاب کا حق ہم خود قاری کو دیتے ہیں کہ وہ گہرے غور و خوض اور اپنے حالات اور اردگرد کے ماحول کو مدنظر رکھ کر ان میں سے جس کا چاہے انتخاب کرے۔

معاشرہ کی تعمیر میں فرد کا کردار

دعوتِ دین، انقلابِ اسلامی اور اصلاحِ معاشرہ کی ضرورت اور اس حوالہ سے افرادِ معاشرہ کے فرائض و ذمہ داریوں کے حوالہ سے جب کبھی گفتگو ہوتی ہے اکثر لوگوں کی جانب سے اس خیال کا اظہار کیا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں مفاسد و انحرافات اس قدر پھیل چکے ہیں کہ ان کا سدِّباب ایک یا چند افراد کے بس کی بات نہیں۔

پورا معاشرہ نہایت تیز رفتاری سے مادیت اور لادینیت کی جانب بڑھ رہا ہے، تمام

ذرائع ابلاغ اور تعلیمی و ثقافتی مراکز کا رخ انسان کو تباہی و بربادی سے دو چار کردینے والے عوامل کی جانب ہے۔

جب زبوں حالی اس حد تک پہنچ چکی ہو تو ایک فرد یا چند افراد کیونکر اس کا تدارک کرسکتے ہیں؟ اور ایک فرد کی جدو جہد کس قدر افادیت کی حامل ہو گی؟

یہ انداز فکر درست نہیں گو کہ انفرادی عمل کے اثرات گروہی عمل کے اثرات جیسے تو نہیں ہو سکتے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مفسدات کے مقابل خاموش تماشائی بن کر بیٹھا رہا جائے۔ بلکہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ اپنی بساط بھر اسلام کی خدمت کرے اور یہی انفرادی عمل رفتہ رفتہ گروہی عمل کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر یہ انفرادی جنبش گروہی عمل کی تمہید' اس کا مقدمہ اور ایک وسیع انقلاب کی بنیاد قرار پائے گی۔

اگرچہ ایک معاشرہ میں مکمل انقلاب گروہی عمل ہی کے ذریعہ ممکن ہے لیکن گروہی عمل کے اسباب و وسائل کی فراہمی اور دشوار ترین دور میں اس کی بنیاد انفرادی عمل ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا سوال کا مفصل جواب ہم دوسرے باب میں دے چکے ہیں۔ ذیل میں انفرادی عمل کی ضرورت کی چند وجوہات بیان کرتے ہیں۔

پہلی وجہ

ہر مسلمان اس عقیدہ کی رو سے کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ خدا کے دین کی تبلیغ اور دعوتِ الی اللہ کے فریضہ کی ادائیگی پر مامور ہے۔ خواہ دوسرے لوگ اس میدان میں سرگرمِ عمل ہوں یا نہ ہوں' خواہ وہ اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہوں یا نہیں۔

دوسری وجہ

اسلامی تعلیمات کا ایک بنیادی اصول "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہر مسلمان پر دعوت و تبلیغ اور ہدایت و ارشاد کا فریضہ عائد کرتا ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی

دوسرے مسلمانوں کے ساتھ دینے سے مشروط نہیں۔ یعنی ہر فردِ مسلم پر ذاتی طور سے اس فریضہ کی ادائیگی واجب ہے خواہ بقیہ مسلمان یہ فریضہ بجالاتے ہوں یا نہیں۔

تیسری وجہ

گروہی عمل کا فقدان ہوتے ہوئے اگر انفرادی عمل سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ

☆ مسلم معاشرہ خواب غفلت میں پڑا رہے۔

☆ ظالموں اور اسلام دشمن عناصر کے لئے میدان خالی چھوڑ دیا جائے کہ وہ جو چاہیں کریں اور یوں مسلمان عملاً ان کے سامنے ہتھیار پھینک دیں۔

☆ اسلامی نظام کا نفاذ اور تبلیغ و دعوت کا عمل تعطل کا شکار ہوجائے۔

اسلامی نکتہ نظر سے یہ نتائج کسی صورت میں قابل قبول نہیں۔

چوتھی وجہ

انفرادی عمل گو کہ گروہی عمل سے زیادہ مفید نہیں لیکن پھر بھی بہت سے فوائد کا حامل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ انفرادی عمل، اجتماعی اور گروہی عمل کی بنیاد بن سکتا ہے۔ تاریخ کے صفحات میں غالباً کسی ایسے گروہی عمل کا تذکرہ نہیں ملتا جو انفرادی عمل کے بغیر رونما ہوا ہو۔ بلکہ ابتداء میں ہر عمل کا انفرادی صورت میں آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ گروہی عمل کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

ایک فرد یا چند افراد معاشرہ کی خرابیوں، خامیوں اور مسائل ومشکلات محسوس کر کے نہایت سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد ان کے علاج کی تدبیر اور منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ پھر اس تدبیر اور منصوبہ کو جامہ عمل پہنانے کی خاطر میدان عمل میں قدم رکھتے ہیں اور جدوجہد کا آغاز کرتے ہیں۔ ان افراد کی تبلیغ اور مساعی کے نتیجہ میں یہ ادراک واحساس مزید افراد میں منتقل ہوتا ہے۔ یوں ان چند باشعور افراد اور مبلغین کی جہد اور کاوش کی بناء پر اس احساس و ادراک کے حامل افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا

جاتا ہے۔ نتیجۃً یہ افراد پوری امتِ اسلامیہ یا کم ازکم اپنے ملک میں مسلم معاشرہ کو اپنے اہداف و مقاصد سے روشناس کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

انفرادی عمل مطلوبہ تبدیلی کے لئے بیج کا کردار ادا کرتا ہے۔ بیج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پھل پھول کر ایک بڑے خطہ زمین کو سایہ فراہم کرسکتا ہے۔ باالفاظ دیگر بیج صحیح نشوونما کی صورت میں ایک سرسبز و شاداب گلشن کی صورت میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

بیج دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک نشوونما پاکر برگ و بار دیتے ہیں اور ان کے گل و بوٹے فضاء کو معطر کردیتے ہیں۔ دوسرے کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

ایک مسلمان مذکورہ دونوں بیجوں کاکام انجام دے سکتا ہے۔ اگر اس کا عمل اور جدوجہد مثبت نتائج پیدا کر سکے اور وہ دوسرے افراد اور معاشرہ کو اپنا ہم خیال و ہم فکر بنانے میں کامیاب ہو جائے تو گویا اس نے مطلوبہ ہدف پالیا۔ لیکن اگر ایسانہ ہو سکے تو یہ مخالفین کو ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل سے باز رکھنے اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے میں خارِ راہ کی طرح نمودار ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر وہ اپنے نظریات کو معاشرہ میں عام نہ کرسکے تو مخالفین کے افکار و نظریات کو بھی عام ہونے اور رواج پانے نہیں دیتا۔

"محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذالک مثلھم فی التوراتہ و مثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطئہ فٰازرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار"

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو ان کے ساتھ ہیں کافروں کے لئے سخت اور آپس میں رحم دل ہیں۔ تم ان کو رکوع و سجود کی حالت میں دیکھو گے کہ وہ خدا کے فضل اور اس کی خوشنودی کے خواستگار ہیں۔ ان کی علامتیں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہیں۔ یہ مثل تو

ان کی تورات میں بیان کی گئی ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثل ہے کہ
وہ کھیتی کے مانند ہیں کہ اس نے اپنی کونپلیں نکالیں پھر اپنے تنے
پر کھڑی ہو گئی اب کھیتی کرنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے تاکہ
ان کے ذریعہ سے کفار کو غصہ دلائے۔" (سورہ فتح ۴۸ آیت ۲۹)

مذکورہ بالا مطالب ایک فکری تجزیہ کا خلاصہ تھے اگر ہم انسانی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے انقلابات کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ ہر انقلاب کے پسِ پشت جو منظم قوتیں کارفرما تھیں ان کی ابتداء انفرادی عمل ہی کے ذریعہ ہوئی تھی اور پھر بتدریج رفتہ رفتہ یہ انفرادی کوششیں اجتماعی و گروہی عمل کی صورت اختیار کر گئیں۔

خود تاریخِ اسلام اس حقیقت کی شاہد ہے کہ رسولِ مقبولؐ اپنی دعوت کے آغاز کے وقت تن تنہا تھے۔ ابو ذر غفاریؓ نے عمالِ اقتدار کے انحرافات کا تن تنہا مقابلہ کیا۔ سید جمال الدین افغانی جنہوں نے عالمِ اسلام کی رگوں میں تازہ لہو دوڑایا' اس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکی' تنہا سرگرمِ عمل رہے۔ عصرِ حاضر میں تاریخ کا رخ موڑ دینے والے ایران کے اسلامی انقلاب کے بانی اور عالمی اسلامی تحریک کے قائد حضرت امام خمینی قدس سرہ نے تن تنہا اپنی تحریک کی بنیاد رکھی۔

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ انفرادی عمل رفتہ رفتہ گروہی عمل کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ہمہ گیر و آفاقی نتائج کا باعث بنتا ہے۔

☆—☆—☆

باب پنجم

مراحلِ عمل

کسی بھی کام کی کامیابی کا دارومدار اس کی بہتر منصوبہ بندی پر ہوتا ہے۔ کام خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی' ہدف چاہے قریب ہو یا بعید۔ کامیابی کے ساتھ کام کی تکمیل اور ہدف تک جلد رسائی کے لئے سوچ و بچار اور تمام پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد تیار کردہ منصوبے کو کلیدی مقام حاصل ہے۔

منصوبہ بندی کے ضمن میں اس کام کے مختلف مدارج و مراحل کا تعین بھی شامل ہے جسے مبلغ انجام دینا چاہتا ہے تاکہ قبل از وقت اس کے علم میں ہو کہ کس وقت کونسا اقدام مناسب ہے اور اس کے بعد کونسے اقدام کی ضرورت ہے اور اس کے لئے کیا تیاری کی جائے۔

یہ ایک نہایت نامناسب اور غیر فطری بات ہوگی اگر کوئی اپنے تمام نظریات و خیالات کو بیک وقت جامہ عمل پہنانے کی کوشش کرے جبکہ ابھی اس کام کے لئے حالات سازگار کرنے کا مقدماتی کام بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پایا ہو۔

ذیل میں ہم ان وجوہات و اسباب کا ذکر کریں گے جن کی بناء پر کام کو مختلف مراحل میں انجام دینا ضروری ہے۔

پہلی وجہ

علماء کرام اور مبلغین کی قلت اور مذہبی کارکنوں کی خاطر خواہ تعداد کا ناپایا جانا اس امر کا متقاضی ہے کہ افرادی قوت کے مطابق کام کو مرحلہ وار اور قدم بقدم انجام دیا جائے اور رفتہ رفتہ ان افراد کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دائرہ کار کو وسعت دی جائے۔

دوسری وجہ

ہر معاشرہ میں موجود افراد مختلف طبائع اور متفاوت سطحِ فکر کے حامل ہوتے ہیں جس کی بناء پر تمام طبقہء فکر کے افراد فوری طور انقلاب اور تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوتے لہٰذا انقلاب کے لئے تدریجی طور پر راہ ہموار کی جاتی ہے اور معاشرہ کے مختلف طبقات اور مختلف فکری صلاحیتوں اور طرزِ فکر رکھنے والے افراد کو بتدریج انقلاب کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے۔

تیسری وجہ

انقلابِ اسلامی کا عظیم عمل بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ اس مقدس مقصد کے حصول کے لئے تدریجی راہ اختیار کی جائے کیونکہ کوئی عقیدہ اور کوئی نظریہ لوگوں پر جبر واکراہ کے ذریعہ نہیں ٹھونسا جاسکتا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے افرادِ معاشرہ کی ایک خاطر خواہ تعداد کے فکر و عقیدہ کی تطہیر کی جائے اس کے بعد ان کے کردار و عمل کی اصلاح کی جائے اور یوں ایک ہمہ گیر انقلاب کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ یہ مراحل ایک بہتر منصوبہ بندی کے متقاضی ہیں۔

چوتھی وجہ

دعوت کے آغاز سے ہی اس دعوت کی معاند قوتیں، استکباری طاقتوں کے ایجنٹ اور دشمنانِ اسلام اس کے خلاف سرگرمِ عمل ہوجاتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اوّلین مرحلہ پر ہی دعوت کو کچل دیا جائے اور اس نہال کو تنومند درخت بننے سے قبل

ہی روند دیا جائے۔ لہٰذا ان حالات میں ایک عاقلانہ روش اور جچے تلے طریقہ کار کی ضرورت ہے اور ایک مخصوص اور سوچا سمجھا اسلوبِ عمل درکار ہے پھر ان رکاوٹوں کے دور ہوجانے کے بعد نئے مرحلہ کا آغاز ہوگا جو لامحالہ سابقہ مرحلہ سے مختلف ہوگا۔

پانچویں وجہ

حضرت رسولِ مقبولؐ کی دعوتی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آپؐ نے اپنی دعوت کے کام کو تین مراحل میں انجام دیا ہر مرحلے کا طریقہ کار اور اسلوب مختلف اور متعین تھا۔ ذیل میں ہم علیحدہ علیحدہ ان تینوں مراحل کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مرحلۂ اوّل

یہ مرحلہ آغازِ وحی اور دعوتِ اسلامی کے ابتدائی تین سالوں پر محیط ہے اس مرحلہ میں مخفی طور پر دعوت کا آغاز کیا گیا اور رازداری کے اصول کو اپنایا گیا۔اس مرحلہ کے دوران مندرجہ ذیل امور انجام پائے۔

الف۔ انفرادی طور پر نہایت رازداری اور خفیہ طریقے سے اسلام کی دعوت دی جاتی تھی اس عمل کا مقصد نئے افراد تک اسلام کا پیغام پہنچانا اور غیر محسوس انداز میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا۔

ب۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والے ہر نئے فرد کی اسلامی تعلیم و تربیت کے لئے ایک فرد کا تعین کیا جاتا تھا (محمد رسول اللہؐ ج۱ ص ۲۸)

ج۔ مسلمانوں کی یہ مختصر جماعت تعلیم و تلاوتِ قرآن اور اقامۂ نماز کے لئے کفارِ قریش کی نگاہوں سے دور مکہ کے اردگرد کسی غار یا درے کا انتخاب کرتی تھی تاکہ کفارِ قریش کے غیظ و غضب اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے سے محفوظ رہیں۔ البتہ صرف رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپؐ کی زوجہ حضرت خدیجہ بن خویلد اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کھلم کھلا مسجد الحرام میں نماز ادا کرتے

تھے۔

د۔ رفتہ رفتہ مخفیانہ تبلیغ کے نتیجے میں جب مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی تو ایک مرکز کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس مقصد کے لئے آنحضرتؐ نے زید بن ارقم کے مکان کو جو کوہ صفا کی جانب واقعہ تھا اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز قرار دیا۔

اس مرکز میں رسولِ مقبولؐ وقتاً فوقتاً نازل ہونے والی آیاتِ قرآنی کی تلاوت فرماتے۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے افراد کی تعلیم و تربیت کا عمل انجام پاتا اور اصحاب رسولؐ آنحضرت سے حکم شرعی دریافت کرتے۔ اس عمل کے ذریعہ رسول گرامیؐ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے قلب و ذہن میں اسلامی تعلیمات اور عقائد و اقدار کو راسخ کردیں تاکہ وہ دشمن کا محکم ارادے اور مضبوط عقیدے کے ساتھ مقابلہ کریں۔ (تاریخ طبری ج ۱ ص ۵۴۱ ۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۰ سیرت مصطفیٰؐ ص ۱۲۶)

اسلامی دعوت کا سلسلہ راز داری کے ساتھ جاری و ساری تھا' مکہ کی سرزمین پر حق پرست اور حق کے متلاشی گروہ کی تعداد چالیس (۴۰) تک جا پہنچی تھی (محمد رسول اللہؐ ج ۱ ص ۲۸)

اس گروہ کی اکثریت جوانوں اور نوجوانوں پر مشتمل تھی (محمد رسول اللہؐ ج ۱ ص ۔ ۲۸' خاتم النبیّین ج ۱ ص ۔ ۳۴۴)

سب سے پہلے جن ہستیوں کو ایمان کی توفیق اور اسلام لانے کی سعادت نصیب ہوئی ان میں حضرت خدیجہ بن خویلد' حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور زید بن حارثہؓ کے نام شامل ہیں۔

(تاریخ طبری ج ۱' ص ۵۴۰' سیرہ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۲۶۲ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۳)

مرحلۂ دوم

رسولِ مقبولؐ تین سال تک خفیہ انداز میں نہایت رازداری کے ساتھ دعوتِ دین کا کام کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ آپؐ کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور آخر کار بالکل فطری طریقہ سے ایک نئے دین کی خبر مکہ کی حدود کو پار کر کے دور دور تک پھیل گئی۔ اس دین کے بارے میں جاننے کے لئے لوگوں کا اشتیاق بڑھنے لگا اور مکہ کے باہر سے بھی لوگ اس دین کی حقیقت جاننے کے لئے آنے لگے اس طرح دعوت کے کام نے اپنے دوسرے مرحلے میں قدم رکھ دیا اب رسول مقبولؐ نے حکمِ الٰہی کے مطابق علیٰ الاعلان تبلیغِ دین اور خدا کی طرف دعوت کا عمل شروع کیا۔ خداوندِ عالم کا ارشاد ہوا۔

فاصدع بماتوء مرو اعرض عن المشرکین

"تم کو جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ کھول کھول کر سنادو اور مشرکین سے کنارہ کش ہوجاؤ۔" (سورۃ حجر ۱۵ آیت ۹۴)

اس مرحلے کے آغاز میں نبی کریمؐ نے دعوت کو دو انداز سے پیش کیا۔

۱۔ کوہ صفا سے عام لوگوں کو دعوت دی۔

۲۔ دعوت ذوالعشیرہ کے ذریعہ اپنے قرابتداروں تک حق کا پیغام پہنچایا۔

آیت قرآن نازل ہوئی

وانذر عشیرتک الاقربین

"اور اپنے بہت قریب کے کنبے والوں کو ڈراؤ۔" (سورۃ شعراء ۲۶ آیت ۲۱۴)

اس حکم کی تعمیل میں آپؐ نے اپنے لگ بھگ چالیس (۴۰) قریبی رشتے داروں کو کھانے کی دعوت پر مدعو کیا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہوگئے تو آپ نے اپنا مدعا بیان کرنا چاہا لیکن ابولہب نے بے جا مداخلت شروع کردی جس کی وجہ سے آپؐ اپنا مقصد بیان نہ کرسکے۔ دوسری شب آپ نے پھر ان سب کو مدعو کیا اور کھانے سے

فراغت کے بعد اپنے عزیزوں کو اسلام کی دعوت دی اور ان تک حق کا پیغام پہنچایا اس دعوت میں دوسری دعوتوں کے برخلاف ایک خاص امتیاز پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ آپؐ نے اس دعوت میں اپنی خلافت اور جانشینی کا بھی واضح الفاظ میں اعلان فرمادیا۔

گو ابھی آپؐ کے تمام اعزاء و اقربا نے آپؐ کی دعوت پر لبیک نہ کہا تھا اس کے باوجود آپؐ نے چند بار حاضرین سے سوال کرنے کے بعد علی ابن ابی طالبؑ کی ولایت کا صراحتاً اعلان فرمایا اور زبان مبارک سے یہ جملے جاری ہوئے۔

ان ھذا اخی و وصیّی و خلیفتی فیکم فلسمعوا لہ واطیعوا

"بے شک یہ (علیؑ) میرا بھائی' میرا وصی اور تم پر میرا خلیفہ ہے۔ پس اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو" (تاریخ طبری ج ا ص ۵۴۳۔ سیرۃ مصطفیٰؐ ص ۱۳۰۔ حیات امیرالمومنینؑ ص ۸۵)

بعض مصادر میں وارثی و وزیری کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ (بحار الانوار ج ۱۸ ص ۱۷۸)

کوہ صفا سے تبلیغِ عام

حضرت محمدؐ کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور لوگوں کو آواز دی جیسے کوئی خاص اعلان کرنا اور کسی اہم واقعہ کی خبر دینا چاہتے ہوں۔ اس زمانے میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ اگر کوئی فرد لوگوں کو کوئی اہم خبر دنیا چاہتا یا کسی خاص واقعہ سے آگاہ کرنا چاہتا تو کوہ صفا پر چڑھ کر با آوازِ بلند پکارتا اور لوگوں کے جمع ہونے پر اپنا مقصد بیان کرتا۔ لہٰذا اس رسم کے مطابق حضورؐ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور کوہ صفا سے بلند آواز میں اہلِ مکہ کو صدا دی۔ اہل مکہ کا ایک جمع غفیر آپؐ کی بات سننے کے لئے جمع ہوگیا تمام مجمع گوش بر آواز تھا کہ آپؐ گویا ہوئے۔

"دیکھو میں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں اگر میں تم سے کہوں کہ ایک ہتھیار بند لشکر دور سے آتا دکھائی دے رہا ہے جو مکہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے تو کیا تم میری اس بات پر یقین کروگے؟ مجمع نے بیک زبان

ہو کر کہا یقیناً ہم تمہاری بات پر یقین کرلیں گے پھر آپؐ نے فرمایا میں تمہیں خدا کے عذاب و عقاب سے ڈراتا ہوں۔" (تاریخ طبری ج ۱ ص ۵۴۲ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۴)

یہ مرحلہ دشمن کی تمام تر مخالفتوں اور ظلم و جبر کے باوجود دس سال کے عرصے میں مکمل ہوا اس مرحلہ میں دشمن کے معاندانہ رویہ اور سخت تعرض کے باوجود رسولِ مقبولؐ جہاد و قتال سے گریز کرتے رہے۔

مرحلۂ سوم

تبلیغِ اسلام کے تیسرے مرحلے کا آغاز مدینہ سے مکہ کی جانب ہجرت سے ہوا اس دور میں مکہ اور اس کے اطراف کے قبائل کے علاوہ مدینہ کے دو سب سے بڑے قبیلے اوس اور خزرج دائرۂ اسلام میں داخل ہوچکے تھے۔ نصیرِ اسلام حضرت ابوطالبؑ اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی یکے بعد دیگرے رحلت کے بعد سرورِ کائناتؐ کا مکہ میں زندگی گزارنا محال ہوگیا تھا لہٰذا خداوندِ عالم کی جانب سے ہجرت کا حکم نازل ہوا۔

واذ یمکر بک الذین کفرو الیثبتوک او یقتلوک اویخرجوک و یمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین

"اور (اے رسولؐ اس وقت کو یاد کرو) جب کفار تم سے چال چل رہے تھے کہ تم کو قید کردیں، یا قتل کردیں، یا نکال دیں وہ (کفار) تو اپنی چال چل رہے تھے اور خدا تعالیٰ بدلا لینے پر آمادہ تھا اور اللہ سب سے بہتر بدلا لینے والا ہے۔" (سورہ انفال ۸ آیت ۳۰)

حضرت محمدؐ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد تحریکِ اسلامی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ گویہ مرحلہ گزشتہ دو مرحلوں ہی کا استمرار تھا لیکن اس میں سابقہ مراحل کے مقابلے میں کافی امتیازات اور نمایاں فرق پائے جاتے تھے۔

پہلا امتیاز یہ کہ کرہ ارض پر مدینہ کی سرزمین میں پہلی مرتبہ اسلامی معاشرہ کا قیام عمل میں آیا۔

دوسرا امتیاز یہ کہ پہلی مرتبہ اسلامی اصول وضوابط پر مبنی حکومت تشکیل دی گئی۔
تیسرا امتیاز یہ کہ حکم عقل و شرع کے مطابق "قوت کا جواب قوت سے" کا اصول اپنایا گیا اور مسلح جنگ و جہاد کے احکام نازل ہوئے۔
چوتھا امتیاز یہ کہ دعوت اسلامی کا دائرہ دنیا کی بڑی طاقتوں تک وسعت اختیار کرگیا اور رسول اکرمؐ نے مراسلوں کے ذریعہ بادشاہوں اور والیان حکومت کو اسلام کی دعوت دی۔

ان مراحل کا مطالعہ اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ پہلے اور دوسرے مرحلے بذات خود ہدف نہ تھے بلکہ ایک عظیم ہدف اور اعلیٰ مقصد تک رسائی کا ذریعہ تھے اور یہ رسولِ کریمؐ کا وہ اندازِ تبلیغ تھا جو خود سازی، افراد سازی، اور پھر معاشرہ سازی سے ہوتا ہوا بالآخر پورے سماج میں اسلامی نظام کے نفاذ پر منتج ہوا۔

دو اہم نکات

(۱) تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اسلام کی تبلیغ، تحریکِ اسلامی کے استحکام، اسلامی حکومت کے قیام اور اس کے دفاع غرض دعوت کے ہر مرحلے میں سب سے اہم کردار نوجوانوں اور جوانوں نے ادا کیا۔ عہد حاضر میں بھی یہ بارِ گراں نوجوان ہی اٹھا سکتے ہیں لہٰذا نوجوانوں کا فرض ہے کہ نئے جذبہ، نئے جوش، نئے ولولے، نئے حوصلے، نئی توانائی اور نئی طاقت کے ساتھ دینِ خدا کی ترویج، اسلامی نظام کے احیاء اور معاشرہ میں اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے اپنا کردار ادا کریں۔ علی ابن ابی طالبؑ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسلام دشمن قوتوں اور طاغوتی عناصر کے خلاف تن من دھن کی بازی لگادیں کیونکہ یہی سعادتِ دارین کی راہ ہے اور یہی انبیاءؑ اور ائمہ علیہم اسلام کی پیروی کا تقاضہ ہے۔

(۲) اسلامی دعوت کی ابتداء کے مراحل کا مطالعہ انفرادی عمل کی

اہمیت و افادیت کو واضح کرتا ہے کیونکہ آغازِ دعوت میں تبلیغ کا کام انفرادی طور پر ہی انجام پایا تھا انفرادی عمل رفتہ رفتہ گروہی عمل کی صورت اختیار کر گیا اور معاشرہ کے حالات یکسر تبدیل کرنے اور ایک ہمہ گیر انقلاب لانے میں معاون ثابت ہوا۔ لہٰذا انفرادی عمل کی اہمیت اپنی جگہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

☆—☆—☆

باب ششم

اسلوبِ عمل (کیفیت اور طریقۂ کار)

گزشتہ باب میں ہم نے منصوبہ بندی کی اہمیت کو بیان کیا' منصوبہ بندی ہی کے ضمن میں اسلوبِ عمل اور طریقۂ کار بھی آتا ہے۔کسی بھی کام کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کا دارومدار اس کے انجام دینے کے اسلوب اور طریقۂ کار پر ہوتا ہے اسلوب اور طریقۂ کار سے ہماری مراد وہ مخصوص انداز ہے جو کسی کام کی بجاآوری یا کسی نظریہ اور فکر کی تبلیغ و ترویج کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔

مبلغ اور داعی حضرات مختلف خطوں کے جغرافیائی ماحول اور وہاں ساکن افراد کے افکار' نفسیات' ثقافت اور معاشرتی ماحول کو ملحوظ رکھ کر اسلوب اور طریقۂ کار کا انتخاب کرتے ہیں۔ کبھی تو ایک ہی طریقۂ کار اور اسلوبِ عمل متعدد مقاصد و اہداف کی تکمیل کے لئے کارگر ثابت ہوتا ہے اور کبھی ہر مقصد اور ہدف کے لئے علیحدہ علیحدہ اسلوبِ عمل اختیار کرنا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

اسی طرح بسااوقات ایک ہی طریقۂ کار مختلف زمانوں میں موثر ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے اور ایک اسلوب دوسرے زمانے کے لئے بالکل کارگر ثابت نہیں ہوتا۔جس کی وجہ سے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نیا اسلوب' جدید اندازِ کار اور

موثر طریقہ کار کی ایجاد ضروری ہوجاتی ہے۔

لہٰذا ضروری نہیں کہ اسلوب اور طریقہ کار ہر دور میں یکساں ہو اور یہ بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانے میں اس دور کے حالات کے مطابق جو طریقہ کار اور اسالیبِ عمل اختیار کئے تھے بعینہٖ انہی طریقوں کی پیروی اور متابعت بھی لازم نہیں کیونکہ ہر دور کے جغرافیائی ' سیاسی' معاشرتی' ثقافتی حالات جداجدا ہوتے ہیں اور ان میں کبھی بھی مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ البتہ جہاں انبیاء کرام کے زمانے کے حالات سے موجودہ دور کے حالات مماثل ہوں وہاں انبیاء کا اختیار کردہ طریقہ اور اسلوب ہی سب سے احسن اور بہتر ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو کو اس مثال کے ذریعہ آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تبلیغِ رسالت کے محض تیرہ سال بعد ہی حکومتِ اسلامی کے قیام میں کامیاب ہوگئے لیکن ممکن نہیں کہ ہر خطۂ زمین پر اٹھنے والی اسلامی تحریکیں تیرہ سال ہی کے عرصہ میں اپنے اپنے خطوں پر اسلامی حکومت قائم کرسکیں۔ یہ مدت کم بھی ہوسکتی ہے اور زیادہ بھی۔ کسی فکر کے رواج اور کسی مقصد اور ہدف تک رسائی کے لئے صحیح اسلوب اور جاذب طریقہ کار کے ساتھ ساتھ ذرائع اور وسائل کا درست اور بروقت استعمال بھی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

ہر کام کی انجام دہی کے لئے مناسب طریقہ کار اور موثر اسلوب کا انتخاب ہر ایک کے بس کی بات نہیں بلکہ ایسے ہی افراد اس میدان میں کامیابی حاصل کرپاتے ہیں جو نہایت تجربہ کار' زیرک و دانا اور تخلیقی قوتوں کے مالک ہوں۔ ظاہر ہے تمام افرادِ بشر میں یہ خصوصیات یکساں نہیں پائی جاتیں بلکہ کم ہی افراد ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اِسی لئے مختلف مسائل کے حل کے حوالہ سے پیش کئے جانے والے افکار و نظریات کبھی تو کامیاب اور ثمر بخش ثابت ہوتے ہیں اور کبھی ناکام اور بے ثمر۔

کبھی ناکامی کی وجوہات عدم تجربہ ' فہم و بصیرت اور تخلیقی قوتوں کا فقدان جیسے عوامل اور کبھی کلی طور پر اس فکر کا باطل ہونا ہوتے ہیں جس پر اس حل کی بنیاد رکھی گئی ہے

لہٰذا داعیانِ اسلام کے لئے بھی اپنی دعوت لوگوں تک پہنچانے اور اس کے عملی نفاذ کے لئے فہم و بصیرت ' تخلیقی قوت اور زیرکی و دانائی کی ضرورت ہے۔ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں پیش کیا جانے والا ایک حل کارگر ثابت نہ ہو تو نہایت غوروفکر ' تدبّرو تعقل اور گزشتہ ناکامی کا بغور جائزہ لے کر اس کے کمزور پہلوؤں پر نگاہ رکھ کر ان سے سبق حاصل کرتے ہوئے نیا حل پیش کرنا چاہئے لیکن اپنی زندگی کے مشن اور اپنی دعوت کی تبلیغ اور رواج کے سلسلہ میں مسلسل جدوجہد میں مصروف رہنا ضروری ہے۔

داعیانِ دین کے ذہن نشین رہنا چاہئے کہ تبلیغ افکار میں دعوت پیش کرنے کے طریقے کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے اور اکثر مبلغین نامناسب طرزِ تفکر' دعوت پیش کرنے کے غیر موثر انداز اور مفیدو موثر طریقۂ دعوت سے عدم واقفیت ہی کی بنا پر اپنے تبلیغی مشن میں ناکام رہتے ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم علیحدہ سے اس کو بیان کریں گے۔

اسی طرح داعیان دین کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کامیاب اسلوب اور موثر طریقۂ کار اپنی جزیات کے ساتھ نہ ہی کسی کتاب میں ملتا ہے اور نہ ہی ہمیشہ مفکرین و دانشوروں سے حاصل کیا جاسکتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں کتب اور شخصیات سے موٹے موٹے اصول' قواعد وضوابط اور کلیات کے ذریعہ رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد یہ داعی پر منحصر ہے کہ وہ ان اصولوں اور کلیات کی روشنی میں اپنے ماحول کے تقاضوں کے مطابق کیا طریقۂ کار اور اسلوب اختیار کرتا ہے چنانچہ ہر حادثہ' ہر واقعہ اور ہر درپیش صورتحال کے لئے مناسب اقدام تجویز کرنا اس صورتحال سے دوچار ہونے والے افراد کی صوابدید 'بصیرت اور معاملہ فہمی سے وابستہ ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذاعزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین

"اور ان سے معاملات میں مشورہ کرلیا کرو اور جب تم کسی بات کا پختہ ارادہ کرلیا کرو تو اس وقت اللہ پر بھروسہ کرو۔" (سورہ آل عمران ۳ آیت ۱۵۹)

درحقیقت اسلوب اور طریقہ کار کے انتخاب کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی مریض کے مرض کی تشخیص کے بعد اس کے لئے مناسب دوا تجویز کرنا۔ اگرچہ مرض کی تشخیص خود علاج کے لئے ایک اہم عنصر ہے مگر محض مرض کی تشخیص اسوقت تک مریض کے لئے بے سود ہے جب تک اس کے لئے مناسب دوا کا انتخاب نہ ہوجائے یہ بھی ممکن ہے کہ تجویز کردہ دوا مذکورہ مریض کے مزاج کے مطابق نہ ہو لہٰذا اس کے استعمال سے ردِّعمل کے طور پر مزید پیچیدہ اور خطرناک امراض کے پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔اس لئے ایک دینی مبلغ اور داعیٔ انقلاب اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اخلاقی امراض، معاشرتی مفسدات اور انحراف و کج روی کے ازالہ کے لئے نہایت حکیمانہ انداز میں غوروفکر کے بعد اقدامات بروئے کار لائے اور نہایت دقت کے ساتھ دوا کا انتخاب کرے بصورتِ دیگر نہ صرف یہ اقدامات بے سود ثابت ہوں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ تبلیغی مشن اور دعوتِ حق پر تباہ کن اور ناقابلِ تلافی نقصانات مرتب کرنے کا باعث بھی بن جائیں۔

تبلیغ کا غیر حکیمانہ انداز

یہ اس زمانہ کی بات ہے کہ جب روسی قوم بت پرست تھی شہنشاہ روس "ولادی میر" نے مذاہب کی تحقیق کے لئے ایک اجلاس منعقد کیا اس اجلاس میں دوسرے مذاہب کے علماء و دانشوروں کے ساتھ ساتھ علمائے اسلام بھی مدعو تھے اس غرض کے لئے قازان سے تشریف لانے والے صاحب نے اسلام کے تمام عقائد فلسفے اور تعلیمات کو تو ایک طرف رکھا اور صرف یہ مسئلہ منتخب کرکے پیش کیا کہ اسلام میں سور کا گوشت قطعاً" حرام ہے۔

> روسی مورخ لکھتے ہیں کہ شہنشاہ روس "ولادی میر" اسلام کی جانب مائل تھا اور چاہتا تھا کہ پوری روسی قوم کے لئے مذہبِ اسلام کا انتخاب کرے لیکن قازانی عالم نے شریعت کے تمام احکام میں سے صرف اس مسئلہ کو پیش کرکے اس پر اس قدر زور دیا کہ شہنشاہ نے

غصہ میں آکر انہیں دربار سے باہر نکلوادیا اور عیسائی مذہب قبول کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھ کروڑ افراد عیسائی ہوگئے"۔

(اردو ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۲۱۷ نقل از ماہنامہ "الرسالہ" نئی دلی فروری ۱۹۸۵ء)

یہ واقعہ بطورِ نمونہ پیش کیا گیا اب ہم مذکورہ موضوع پر اسلامی مصادر میں مذکور کلیات کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ مبلغِ دینی کو مقامِ عمل اور کلیات کی تطبیق کے موقع پر مدد مل سکے۔

قرآنی ہدایت

"ادع الی سبیل ربک بالحکمتہ و الموعظتہ الحسنتہ وجادلھم بالتی ھی احسن

"تم اپنے پرور دگار کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ساتھ ان کو دعوت دو اور ان سے اس طریقہ سے بحث کرو جو بہت ہی اچھا ہو۔" (سورہ نحل ۱۶ آیت ۱۲۵)

ادفع بالتی ھی احسن السئیتہ "(اے رسول) تم بدی کو اس چیز سے دفع کرو جو بہت ہی اچھی ہو۔" (سورہ مومنون ۲۳ آیت ۹۶)

"ولا تستوی الحسنتہ ولا السیئتہ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم ومایلقا ھا الا الذین صبرو اوما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔"

"اور نیکی اور بدی تو برابر ہوتی نہیں، تم بدی کو اس طریقہ سے دور کرو جو بہت اچھا ہو۔ تو یکایک وہ شخص جس کے اور تمہارے مابین عداوت ہوگی ایسا ہوجائے گا جیسے سرگرم دوست ہوتا ہے اور اس خصلت کے قبول کرنے کی توفیق سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا ہے اور کسی کو نہیں ملے گی اور اس خصلت پر عمل کرنے کی توفیق سوائے ان

کے جن کا حصہ بہت بڑا ہے کسی اور کو نہ ملے گی۔" (سورہ فصلت ۴۱ آیت ۳۴، ۳۵)

اذھبا الی فرعون انہ طغیٰ فقولا لہ قولاً لینا لعلہ یتذکر او یخشی

"تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے پس تم دونوں اس سے نرم نرم باتیں کرو تاکہ وہ نصیحت حاصل کرے یا (کم از کم) ڈر ہی جائے۔" (سورہ طہ ۲۰ آیت ۴۳، ۴۴)

اذھب الی فرعون انہ طغیٰ فقل ھل لک الی ان تزکیٰ و اھدیک الیٰ ربک فتخشیٰ

"اے موسیٰ فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہوگیا ہے پھر اسے کہو کہ آیا تجھے اس بات کی خواہش ہے کہ تو (شرک و آلودگیوں سے) پاک ہوجائے اور تجھے تیرے پروردگار کی طرف رہنمائی کروں تاکہ تو ڈرے۔" (سورہ نازعات ۷۹ آیت ۱۷، ۱۸)

والذین صبروا ابتغاء وجہ ربھم و اقاموالصلوٰۃ وانفقوا ممارزقنٰھم سرا وعلانیۃ ویدرؤون بالحسنۃ السیئۃ اولئک لھم عقبی الدار

"اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبر کیا اور نماز پڑھی اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا تھا اس میں سے چھپاکر اور ظاہر طور پر (راہ خدا میں) خرچ کیا اور بدی کا ازالہ نیکی سے کرتے رہے، عاقبت کا گھر انہی کے لئے ہے۔" (سورہ رعد ۱۳ آیت ۲۲)

ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن

"اور اہلِ کتاب سے مجادلہ نہ کرو مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہے۔" (سورہ عنکبوت ۲۹ آیت ۴۶)

مذکورہ بالا آیات دعوتِ دین کے اسلوب اور طریقہ کار کے بارے میں واضح اور روشن ہدایات پر مشتمل ہیں ان کے علاوہ بھی آیاتِ قرآنی اور نصوصِ شرعی میں دعوت

کے اسلوب اور طریقہ کار کی وضاحت پائی جاتی ہے آئندہ سطور میں ہم ان آیات وروایات کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔

ا۔ مخاطب کے جذبات کا احترام

داعیانِ دین کے لئے ضروری ہے کہ دورانِ گفتگو مخاطب کے افکار و نظریات اور عقیدے کا پورا پورا احترام کریں اس کے نظریہ اور عقیدے کا بطلان اس خوبصورت انداز اور احسن طریقہ سے کریں کہ اس کے جذبات و احساسات بھی مجروح نہ ہوں اور آپ کی گفتگو بھی اس کے دل میں اتر جائے۔

مقابل کو اس کے نظریات و عقائد اور سلوک و عمل میں تجدیدِ نظر کی دعوت دیتے وقت اسے مکمل گمراہ اور خود کو مکمل راست رو قرار دینے سے گریز کریں۔ اسی طرح مذہبی اختلاف اور دیگر متنازع فیہ امور پر گفتگو کے موقع پر متشددانہ یا انتہا پسندانہ رویہ اختیار نہ کریں بلکہ دعوت کا عمل اخلاقی ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے خوشگوار ماحول میں انجام پانا چاہئے ورنہ یہ عمل دعوت کے پھیلاؤ کے بجائے فتنہ و فساد اور بسا اوقات فرقہ وارانہ کشیدگی کا سبب بن سکتا ہے۔

ارشادِ قدرت ہے۔

"وانا اوایاکم لعلی ھدی او فی ضلال مبین

"اور (تم کہدو) کہ ہدایت پر یا کھلی گمراہی میں ہم ہیں یا تم ہو۔" (سورہ سباء ۳۴ آیت ۲۴)

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسروں کے غلط عقیدہ کا احترام اپنے درست عقیدہ کے احترام کا ضامن ہے بصورت دیگر ہم خود اپنے عقائد و نظریات کی توہین کا سبب بن سکتے ہیں۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم

"اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو پکارتے ہیں تو تم ان کے ان معبودوں کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ پھر وہ بغیر سوچ سمجھے بے ادبی سے اللہ

کو برا کہیں گے۔" (سورہ انعام ٦ آیت ۱۰۸)

آیات کی تشریح

مذکورہ دونوں آیات میں تبلیغِ حق اور دعوتِ الی اللہ سے متعلق ایک خاص انداز پایا جاتا ہے۔ پہلی آیت میں گمراہ فرد یا ہدایت یافتہ شخص کا تعین نہیں کیا گیا۔ بلکہ انداز گفتگو یہ ہے کہ دونوں فریقین میں سے ایک ہدایت یافتہ اور دوسرا گمراہ ہے اگرچہ داعی الی الحق رسول اکرمؐ کی ذاتِ گرامی تھی جو نہ صرف ہدایت کے اعلی ترین مرتبے پر فائز تھے بلکہ آپ کا وجود تمام عالم کے لئے منبع فیض و برکت اور ہدایت و معرفت کا سرچشمہ تھا پھر بھی آپ نے مشرکین کو یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ ان کا عقیدہ مجروح ہو رہا ہے یا ابتدا ہی سے انہیں ناچیز تصور کیا جارہا ہے بلکہ آپ نے ایسا طرزِ تخاطب اختیار کیا جو انہیں ان کے عقیدہ کی صحت کے بارے میں غور و فکر پر مجبور کردے اور اپنے نظریات و افکار پر نظرثانی کی جانب متوجہ کردے۔کیونکہ مخاطب کے ذہن میں شکوک و شبہات پیدا کرنا ہی غور و فکر پر مجبور کرنے کا پہلا مرحلہ ہے حضورِ اکرمؐ نے آدابِ مناظرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے ہی مرحلہ پر گمراہ اور ہدایت یافتہ فریق کا تعین نہیں کیا کہ کہیں فریقِ مخالف آنحضرتؐ کی گفتگو کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے مناظرہ ہی سے گریز کرنے لگے۔

داعیٔ اسلام کو چاہئے کہ ایسا جاذب اور پرکشش طرزِ تخاطب اختیار کرے جو مخاطب کو خود بخود اس کی بات سننے اور اسکا پیغام سمجھنے پر آمادہ کرے اس بنا پر اگر دورانِ گفتگو حقیقی گمراہ اور واقعی ہدایت یافتہ کی نشاندہی نہ بھی کی جائے تو کوئی حرج نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس سے دور رس فوائد حاصل ہوں۔

عقلی استدلال اور منطقی اندازِ گفتگو خود بخود مخالف کو اپنے نظریات کی قدر و قیمت سے آگاہ کردے گا خود آیتِ شریفہ کا بھی یہی مقصد ہے پھر منصف اور حق و حقیقت کا متلاشی فرد حق کی پیروی کرے گا اور بے بصیرت، متعصب اور بیمار ذہن رکھنے والے پر حجت تمام ہوجائے گی۔

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا

"ان کے دلوں میں روگ ہے خدا ان کے روگ کو اور بڑھا دیتا ہے۔"

(سورہ بقرہ ۲ آیت ۱۰)

..... فانھا لا تعمی الا بصارو لکن تعمی القلوب التی فی الصدور

..... "اس لئے کہ آنکھیں ہی اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ بھی اندھے ہوجایا کرتے ہیں۔" (سورہ حج ۲۲ آیت ۴۶)

اہلِ باطل اور خدایانِ اہل ضلال بذات خود کسی مقام و منزلت یا عزت و احترام کے مالک نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مومنین کو مشرکین کے معبودوں کی توہین سے اس لئے منع فرمایا ہے اور ان پر سب و شتم سے اس لئے روکا ہے کہ کہیں وہ اپنے باطل عقیدہ کے دفاع اور محض ضد کی وجہ سے جواباً مومنین کے درست عقیدے کی توہین نہ کریں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ مبلغِ اسلام اور داعیٔ حق کو اپنے عقیدہ کے احترام اور وقار کی خاطر مخالف کے باطل عقیدے کی توہین اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔

۲۔ آغازِ کار

انسان کی انفرادی زندگی ہو یا سماجی ' ان میں متعدد انحرافات ومنکرات رائج ہوچکے ہیں اور اکثر و بیشتر احکامِ الٰہی کو متروک ہوئے تو سالہاسال کا عرصہ گزر چکا ہے۔

آغازِ کار سے ہماری مراد یہ ہے کہ داعیٔ دین' دین کی دعوت اور انقلابی عمل کا آغاز کہاں سے کرے۔ کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فرد ہو یا معاشرہ اس کا ہر پہلو میں یک دم اصلاح پانا اور تمام احکامِ شرعیہ اور تعلیمات دینیہ کا یک بیک پابند ہوجانا ناممکن ہے لہٰذا فرد اور معاشرہ کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا تعین کیا جائے کہ دعوت کی ابتداء کہاں سے کی جائے اور کس پہلو میں اصلاح کی سب سے پہلے کوشش کی جائے۔

ہمارے خیال میں کام کا آغاز اہم ترین دینی واجبات کی انجام دہی کی تاکید اور محرمات

کو ترک کرنے کی دعوت سے کیا جائے اس سلسلہ میں دعوت دیتے وقت مخاطب کی طاقتِ عمل کا بھی لحاظ رکھا جائے یعنی ایسے کاموں کی جانب مخاطب کو راغب کیا جائے جنہیں وہ سردست انجام دینے کی قوت و قدرت رکھتا ہو۔

یہ پہلا قدم اس کے لئے کُل شریعت پر عمل اور تمام احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لئے سنگِ میل ثابت ہوگا چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ

"ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا! یا رسول اللہ میں نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی سے عاجز ہوں' ہاں دن میں صرف دو رکعت نماز پڑھ سکتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے اس کی اس پیشکش کو قبول کرلیا مگر کچھ ہی عرصہ بعد وہ شخص نمازِ پنجگانہ کا عادی ہوگیا"۔
(خطوات علی طریق الاسلام ص ۲۷)

ان چیزوں سے منع کرنے میں بھی شدید اصرار اور سخت رویہ اختیار کرنا مناسب نہیں جن کی حرمت کی دلیل محکم نہ ہو اور جن کا منکر ہونا اسلامی متون میں شدت کے ساتھ ثابت نہ ہو۔پھر یہ کہ لوگ مختلف وجوہات کی بنا پر انہیں فی الحال چھوڑنے پر بھی تیار نہ ہوں اور ان کے علاوہ دیگر منکرات کو ترک کرنے پر راغب ہوں اور اہم واجبات پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ ہوں۔

"مشہدِ مقدس میں ایک ایسا شخص رہتا تھا جو کسی دین و مذہب کا معتقد نہ تھا۔ بعض مبلغین کی جدوجہد اور دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں وہ پکا نمازی ہوگیا اور ہمیشہ مسجدِ گوہر شاد میں حاضر ہونے لگا...... ایک روز صفِ اوّل میں نماز ادا کرنے والے ایک صاحب اس سے الجھ پڑے اور بولے کیا آپ مسلمان ہیں؟ ...... یہ شخص نہایت حیرت زدہ ہوا اور بولا! جناب عالی کیا مسجد میں نماز ادا کرنے والا غیر مسلم ہو سکتا ہے؟ یہ صاحب بولے اگر آپ مسلمان ہوتے تو یقیناً آپ کے چہرے پر داڑھی ہوتی۔

اسی روز سے یہ شخص ایسا گیا کہ دوبارہ کبھی مسجد کا رخ بھی نہ کیا۔
(حماسہ حسینی جلد ۲ صفحہ ۱۰۰ و ۱۰۱)

اسی طرح لوگوں کو مستحبات کی انجام دہی پر بھی مجبور نہ کیا جائے اور خاص کر اس صورت میں جب کہ وہ ابھی ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی یہ خدشہ بھی موجود ہو کہ مستحبات کی انجام دہی پر اصرار و اجبات و فرائض پر عمل کرنے میں سستی و کاہلی کا باعث ہو گا۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

"جب 'مستحبات' فرائض کی بجا آوری میں سدِّراہ ہوں تو انہیں چھوڑ دو۔" (نہج البلاغہ کلمات نمبر ۲۷۹)

مخاطب کا ذہن دعوت کو قبول کرنے کی کس قدر صلاحیت و استعداد رکھتا ہے اس بات کا لحاظ نہ رکھنا دعوت کی قبولیت میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ اس پر منفی اثرات بھی مرتب کر سکتا ہے اس سلسلے میں بکثرت اسلامی روایات پائی جاتی ہیں۔ داعیانِ اسلام کے استفادہ اور اس مسئلہ کی سنگینی کے پیش نظر ان میں سے محض دو روایات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

"ایک مردِ مسلمان نے اپنے ایک عیسائی پڑوسی کے سامنے دعوت اسلام پیش کی اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اگلے روز اس مسلمان نے اسے علی الصبح بیدار کیا اور اپنے ساتھ مسجد لے گیا۔ نوافل کی ادائیگی کے بعد انہوں نے نماز فجر ادا کی۔ نماز کے بعد اس نو مسلم نے گھر جانے کا ارادہ کیا تو اس مرد مسلمان نے اسے مزید ادعیا اور وظائف میں مصروف کر دیا۔ یوں نمازِ ظہر کا وقت آ پہنچا۔ نمازِ ظہر کے بعد پھر ادعیا اور وظائف کا سلسلہ شروع ہو گیا غرض یہ نو مسلم نماز عشاء کے بعد گھر پہنچ پایا۔

اگلے دن پھر علی الصبح یہ اس کے گھر پہنچ گئے اور مسجد چلنے کی

درخواست کی ۔ اس نو مسلم نے اندر ہی سے جواب دیا کہ بھائی اپنا مذہب اپنے ہی پاس رکھو میں عیسائی ہی بھلا ۔ اس دین کے لئے کسی ایسے فرد کی تلاش کرو جسے دنیا جہاں کا کوئی کام نہ ہو اور اس پر کوئی معاشرتی اور عائلی ذمہ داری نہ ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اس مردِ مسلمان نے خود اپنے ہاتھوں سے اس نو مسلم کو کافر کر دیا جسے مسلمان بنایا تھا۔"

(اصول کافی ج۔ ا ص ۳۶ وسائل ج ۱۱ ص ۴۲۷ و ۴۳۰)

یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جو ایمان کے مختلف درجات کو ظاہر کرتی ہے ۔ اسلامی مصادر خصوصاً اصولِ کافی میں "درجاتِ ایمان" کے عنوان سے ایک پورا باب موجود ہے جس میں اس طرح کی بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ

"اے عبدالعزیز ! ایمان کی مثال اس سیڑھی کی سی ہے جس کے دس زینے ہیں اور مومن زینہ بہ زینہ بلندی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اوپر والے زینہ پر موجود مومن کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ نیچے کھڑے ہوئے مومن کا کوئی ایمان نہیں۔ اگر تم کسی کو نچلے درجہ پر پاؤ تو نہایت شفقت اور محبت سے اسے اپنی جانب دعوت دو اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ مت ڈالو۔ جو شخص مومن کو توڑے یعنی اس کے عقائد کو متزلزل کرے تو اسے چاہئے کہ اس کا ازالہ بھی کرے۔"

(اصول کافی ج ۲ ص ۳۷ جواہر الکلام ج ۲۱ ص ۳۶۴ وسائل ج ۱۱ ص ۴۲۸۔ الحیاۃ ج ۱ ص ۱۴۶)

۳۔ مخاطب کے نفسیات کا لحاظ رکھنا

دورانِ تبلیغ مخاطب خواہ فرد ہو یا معاشرہ' اس کی نفسیات اور ماحول کے مطابق گفتگو کی جائے۔ کیونکہ ممکن ہے ایک مسئلہ یا ایک واقعہ کسی فرد یا معاشرہ کے سامنے دعوت پیش کرنے میں موثر ثابت ہو۔ لیکن دوسرے فرد یا معاشرے کے سامنے اس مسئلہ کا بیان یا اس واقعہ کا اظہار دعوت کے لئے مضر ثابت ہو۔ اس قسم کے اختلاف کا سبب کبھی افراد یا معاشروں کے مابین پایا جانے والا فکری سطح کا تفاوت ہوتا ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مسئلہ یا ایک روایت کسی معاشرہ میں ایک خاص حیثیت اور مسلّم حقیقت کا درجہ رکھتی ہے جب کہ دوسرے معاشرے میں اس مسئلہ یا روایت کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی۔

اس سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں کہ اگر کسی معاشرہ میں کوئی انحراف پایا جاتا ہے اور جسے مقدس رنگ بھی دے دیا گیا ہے تو اس کے مقابل چپ سادھ لی جائے' اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اور اسے برقرار رہنے دیا جائے۔ نہیں' بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے امور کی اصلاح کے لئے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے اور اسے مناسب موقع ملنے تک موخر رکھا جائے۔ بصورتِ دیگر معاشرہ میں لاحاصل کشمکش اور بے نتیجہ مسائل جنم لیں گے اور ممکن ہے کہ ابتدائی مرحلہ ہی میں اصلاح کے تمام راستے بند ہو جائیں۔

۴۔ سختی نہیں نرمی

دعوت کے آغاز ہی میں سخت رویہ اور شدت پسندی مناسب نہیں۔ نہایت ملائمت اور نرمی سے دعوت کا آغاز کرنا چاہئے۔ پھر اگر نرم روی ہی سے کامیابی کی امید ہو تو شدت اور سختی کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر اس انداز سے دعوت کے مقاصد کا حصول ممکن نہ ہو تو پھر سماجی ماحول اور معاشرتی ردِّ عمل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے دوسرا اسلوب (شدت) اپنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں حضرت موسیٰؑ کو فرعون کو دعوت دینے کے لئے بھیجتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے۔

"اذھبا الی فرعون انہ طغیٰ فقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر او یخشی"

"تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے - پس تم دونوں اس سے نرم نرم باتیں کرو تاکہ وہ نصیحت حاصل کرے یا (کم از کم) ڈر ہی جائے۔" (سورۃ طہ ۲۰ آیت ۴۳)

"اذھب الی فرعون انہ طغیٰ فقل ھل لک الی ان تزکی۔"

"(اے موسیٰؑ) فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ سرکش ہو گیا ہے پھر اس سے کہہ دو کہ آیا تجھے اس بات کی خواہش ہے کہ تو (شرک و برائی سے) پاک ہو جائے۔" (سورہ نازعات ۷۹ آیت ۱۷-۱۸)

نرمی، خندہ پیشانی، پیار و محبت اور حسنِ کلام میں ایک منفرد خصوصیت پوشیدہ ہے جو شدت اور سخت انداز میں ہرگز نہیں چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے

"..... ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم و مایلقا ھا الا الذین صبرو اومایلقا ھا الاذو حظ عظیم"

"تم بدی کو بہت اچھے طریقے سے دور کرو۔ پھر وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہو گی ایسا ہو جائے گا جیسے سرگرم دوست ہوتا ہے اور اس خصلت کے قبول کرنے کی توفیق سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا ہے اور کسی کو نہیں ملے گی اور اس خصلت پر عمل کرنے کی توفیق سوائے ان لوگوں کے جن کا حصہ بہت بڑا ہے کسی اور کو نہ ملے گی۔" (سورۃ فصلت ۴۱ آیت ۳۴-۳۵)

عداوت کا دوستی میں، نفرت کا محبت میں، تفرقہ کا اتحاد میں، کدورت کا اخلاص و صفائی میں بدل جانا پیار و محبت اور نرمی و خنداں پیشانی کا خاصا ہے۔

بعض اوقات بے جا سختی سے نہ صرف کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ شدید منفی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں لہٰذا روایات میں نرمی کی بجائے سخت رویہ اختیار کرنے والوں کی مذمت وارد ہوئی ہے خواہ یہ اسلوب کتنا ہی نیک نیتی پر مبنی ہو۔ چنانچہ اہل نار

علماء کی ایک قسم کا تذکرہ یوں آیا ہے۔

"اذا وعظ انف واذا وعظ عنف فذاک فی الدرک الثانی من النار الاداب المعتوبتہ للصلاہ

"جہنم کے دوسرے درجہ میں وہ عالم ہو گا کہ جو خود اپنے لئے وعظ و نصیحت کو ناپسند کرتا ہے اور خود دوسروں کے لئے وعظ و ہدایت کے موقع پر سختی سے پیش آتا ہے۔" (خصالِ صدوق ص ۳۰۴)

اس موضوع کی وضاحت اس سے قبل ہم باب چہارم میں کر چکے ہیں۔

۵۔اختلافی مسائل سے گریز

مبلغِ اسلام اور داعیٔ اصلاحِ معاشرہ کو ان اختلافی مسائل کو چھیڑنے سے گریز کرنا چاہئے جن کا اثبات یا جن کی نفی عملی زندگی کو متاثر نہیں کرتی اور یہ مسائل انفرادی یا اجتماعی زندگی پر اثرانداز نہیں ہوتے۔ ان اختلافی اور غیرضروری مسائل سے بعض اوقات ایک ہی مذہب کے ماننے والے دوچار ہوتے ہیں۔ مذاہبِ اسلامیہ کے مابین تو ایسے نزاعی مسائل صدیوں سے فتنہ و فساد کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

ممکن ہے ان مسائل میں ایک فریق انحراف کی راہ پر ہو تو اس کی اصلاح رفتہ رفتہ ماحول کے سدھار کے ساتھ ساتھ کسی فتنہ و فساد کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔

ان اختلافی مسائل پر توجہ مرکوز کئے رکھنے سے جو مضر اور غیرمطلوبہ نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کی مختصر فہرست پیش خدمت ہے۔

(۱) انتہائی اہم اور ضروری مسائل سے غفلت اور لاپرواہی برتی جانے لگتی ہے اور ان پر کماحقہ توجہ نہیں دی جاتی۔

(۲) اسلامی نکتہ نظر سے بھی لایعنی مسائل کی کھوج میں رہنا مناسب نہیں۔ کیونکہ انسان مذکورہ مسائل سے آگاہی رکھنے کا پابند نہیں اور روزِ قیامت ان مسائل کے بارے میں اس سے کوئی بازپرس بھی نہ ہو گی۔

(۳) بعض اوقات بلکہ کبھی کبھی تو اکثر ان مسائل میں الجھنا صراطِ مستقیم اور سیدھے

راستے سے دوری کا باعث ہو جاتا ہے اور ان کے ذریعے فتنہ و فساد اور انحراف و کج روی کے راستے کھل جاتے ہیں۔

(۴) ان مسائل میں الجھنا تضیع اوقات کے ساتھ ساتھ جان و مال کے اتلاف کا سبب بھی بن جاتا ہے۔

(۵) فکری صلاحیتیں ان ہی مسائل کے بارے میں موشگافیوں کی نظر ہو جاتی ہیں۔

مقررین اور خطباء کی اکثر لایعنی اور غیر ضروری بحثیں انبیاء و ائمہ معصومین علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ سے مربوط ہوتی ہیں مثلاً آیا انبیاءؑ و ائمہؑ نوری تھے یا خاکی' ان کی تخلیق عام انسانوں کی مانند ہوئی یا کسی اور طریقہ سے ..... وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ہم واضح کر دیں کہ ہماری مراد یہ نہیں کہ ان اختلافی مسائل کو مکمل طور پر فراموش کر دیا جائے اور ان کے متعلق کلی طور پر خاموشی اختیار کر لی جائے۔ کیونکہ یہ بات عملاً ناممکن ہے پھر ان اختلافی مسائل میں بعض ایسے مسائل بھی شامل ہیں جو دینی تعلیمات میں بنیادی مقام کے حامل ہیں اور ان مسائل پر بحث و تمحیص کے دروازوں کو بند کر دینا دین ہی کو خیرباد کہہ دینے کے مترادف اور اس کے حقیقی روشن چہرے کو محو کر دینے کا ذریعہ بھی ہو جائے گا۔

اقتضائے زمان یہ ہے کہ کل اسلام کی حفاظت اور اندرونی اختلافات کو کم سے کم کرنے کے لئے فی الحال ایسے ہی مسائل کو موردِ بحث قرار دیا جائے جو اسلام کی بقا' استمرار اور سطوت و شوکت میں اضافے کا ذریعہ بن سکیں۔

لہٰذا ہم اکثر اختلافی مسائل میں بحث و تمحیص پر قدغن کے قائل نہیں بلکہ جو طریقہ کار اور اسلوب آج کل ہمارے معاشرہ میں رائج ہے اور جو محض نفرتوں میں اضافے اور اختلافات کی خلیج کو مزید وسیع کر رہا ہے اس کے مخالف ہیں۔

دو جید علماء کرام کے خیالات

مرحوم آیت اللہ محسن امین عاملی (لبنان) فرماتے ہیں۔

"اہلِ مشرق خلافت کے متعلق آپس میں لڑتے رہے اور نتیجۃً

فرانسیسی نمائندہ ان سب پر خلیفہ بن بیٹھا۔" (یعنی مشرق وسطیٰ کے اکثر اسلامی ممالک پر فرانس کی حکومت اس کے نمائندوں کے توسط سے قائم ہوئی)

مصری عالم عبدالعزیز بشری کہتے ہیں۔

"ہم پیر کے دھونے یا مسح کرنے میں باہمی اختلافات کا شکار رہے مگر حالت یہ ہو گئی کہ روئے زمین پر ہمارے قدم جمانے کی جگہ نہ رہی۔"

مذکورہ دونوں علمائے کرام نے تو اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہ ہونے کی بنا پر محض نظریاتی حدود اور علمی دائرہ میں بھی اختلاف کو گوارا نہ کیا لیکن ان بزرگوں کو کیا علم کہ ملکِ عزیز پاکستان میں تو مفسد عناصر معمولی معمولی اختلافی مسائل کو ہوا دے کر بھائی کو بھائی سے لڑا رہے ہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مسلسل جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

۶۔ غیر مناسب ردِّ عمل

اسلامی دعوت اور اصلاحِ فرد و معاشرہ ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس میدان میں قدم قدم پر مصیبتوں، رکاوٹوں، مخالفتوں اور توہین آمیز رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مبلغ کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں، پھول نچھاور نہیں کئے جاتے۔ نعرۂ داد و تحسین کی بجائے توہین آمیز کلمات اور سخت سست سننا پڑتی ہیں۔

ان حالات میں مبلغ کو جذباتیت کا شکار ہونے کی بجائے ہوش و حواس کے ساتھ مخالفتوں اور مخاصمتوں کو برداشت کرتے ہوئے حسنِ اخلاق اور شیریں کلامی سے اپنی بات لوگوں تک پہنچانی چاہئے اور کسی ایسے نامناسب ردعمل سے گزیر کرنا چاہئے جو اس کی شخصیت کو مجروح کر دینے کا باعث ہو کیونکہ ایسا ردِّعمل دعوت کے نفوذ اور اس کے پھیلاؤ کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو انشاء اللہ باب ہفتم میں "داعی کی صفات" کے عنوان سے کریں گے۔

اس سلسلے میں قرآن کریم اور سیرتِ ائمہ علیہم السلام میں بیان شدہ ہدایات پر نظر

ڈالتے ہیں۔ ارشاد قدرت ہے۔

"ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم"

"تم بدی کو اس انداز سے دور کرو جو انداز سب سے اچھا ہو (ایسا کرنے کی صورت میں) وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی ایسا ہو جائے گا گویا سرگرم دوست ہے۔" (سورۃ فصلت ۴۱ آیت ۳۴)

"قل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم ان الشیطان کان للانسان عدوا مبینا"

"اور (اے رسولؐ) میرے بندوں سے کہدو کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت ہی اچھی ہوں یقیناً شیطان ان میں فساد ڈالتا ہے بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۵۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جابجا ایذا رسانیوں' مصائب و مشکلات اور توہین آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ کی زبانِ مبارک پر ان مواقع پر بھی یہی دعا رہی کہ

"الھم اھد قومی فانھم لایعلمون انی رسول اللہ"

"پروردگار! میری قوم کی ہدایت فرما۔ یہ لوگ میری رسالت و نبوت کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔"

ائمہ معصومین علیہم السلام کا بھی یہی اسلوب رہا اور مخالفین کی نازیبا حرکات اور اہانت آمیز سلوک کا نہایت صبر و شکیبائی اور حکمت سے مقابلہ کیا۔ اس سلسلے میں تحقیق کے جویا اور تفصیلات کے متلاشی آپ حضرات کی سیرت اور حالات زندگی پر تحریر کی گئی مفصل تالیفات کا مطالعہ فرمائیں۔

☆——☆——☆

باب ہفتم

مبلغ کی صفات

دعوت کی کامیابی کے متعدد عوامل میں سے ایک اہم عامل خود داعی کا کردار اور اس کی شخصیت ہے۔

داعیٔ دین اور مبلغِ اسلام کا مقصد دراصل رسول کریمؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کے مقاصد کی تکمیل ہے لہٰذا اسے ان ذواتِ مقدسہ کی سیرت اور کردار کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مبلغِ اسلام کا تعلق جس قدر سیرتِ انبیاءؑ اور تعلیماتِ قرآنی سے مضبوط ہو گا اسی قدر اس کے قول و فعل میں جاذبیت اور کشش پائی جائے گی۔

ہدایتِ قرآن ہے۔

" قد کانت لکم اسوۃ حسنتہ فی ابراھیم والذین معہ"

"بے شک تمہارے لئے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو ان کے ساتھ تھے اچھا نمونہ موجود ہے۔" (سورہ ممتحنہ ۶۰ آیت ۴)

" لقد کان لکم فیھم اسوۃ حسنتہ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر۔"

"بے شک تمہارے لیے ان لوگوں میں اچھا نمونہ موجود ہے۔ البتہ اس کے لیے جو اللہ کی اور قیامت کے دن کی امید رکھتا ہے" (سورۂ

ممتحنہ ۶۰ آیت ۶)

" لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ و الیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا۔"

"بے شک تمہارے لیے پیروی کرنے کو اچھے سے اچھا نمونہ خود رسول اللہ (کی ذاتِ گرامی) میں موجود ہے۔ البتہ اس شخص کے لیے جو اللہ اور روزِ قیامت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت ہی یاد کرتا ہو۔"

(سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۲۱)

داعیٔ اسلام کو رہن سہن میں، رفتار و عمل میں، لباس و پوشاک میں، تواضع و انکساری میں، سنجیدگی و بردباری میں، صبر و استقامت میں، بصیرت و آگاہی میں دوسروں کے لیے نمونہ اور اسوۂ حسنہ ہونا چاہیے۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم آئندہ صفحات میں داعی کی صفات و شرائط کو نکتہ وار تفصیل سے بیان کریں گے۔

۱۔ تقویٰ و اخلاص

یوں تو تقویٰ و پرہیزگاری اور خلوصِ نیت ہر مسلمان سے مطلوب ہے۔ لیکن داعی کو اسلامی فکر کا ترجمان اور اس کا مبلغ ہونے کے حوالہ سے بدرجہ اتم ان صفات کا مالک ہونا چاہیے۔

داعی کا ہر فعل، ہر قول، ہر حرکت، ہر سکون غرض زندگی کی ہر جنبش تقویٰ و اخلاص کا مظہر ہو۔

" واتقون یا ولی الالباب"

"اور صاحبانِ عقل مجھ سے ڈرتے ہیں۔" (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۹۷)

"و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب"

"اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا خدا اس کے لیے بچاؤ کی راہ پیدا کر

دے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچائے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو۔"(سورہ طلاق ۶۵ آیت ۲۔ ۳)

"یا ایھا الذین اٰمنوا ان تتقو اللہ یجعل لکم فرقانا"

"اے ایمان لانے والو اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے واسطے ایک حق و باطل کی جانچ مقرر کر دے گا۔" (سورہ انفال ۸ آیت ۲۹)

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ و بذالک امرت وانا اول المسلمین"

"تم کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب عالمین کے پالنے والے کے لیے ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں اور اس کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مکمل تسلیم کرنے والا ہوں" (سورۂ انعام ۶ آیت ۱۶۲۔ ۱۶۳)

۲۔ ذاتی مفادات کی قربانی

ذاتی مفادات کی قربانی کا جذبہ اور انفرادی مصالح سے گریز بھی داعی اسلام کی خصوصیات میں سے ہے۔

ارفع مقاصد' بلند اہداف اور گراں بہا مذہبی فرائض کی انجام دہی کے موقع پر ذاتی مفادات اور انفرادی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی جان سے بھی گزر جانے کا عزم رکھنا ایک کامیاب داعی کے لیے ضروری ہے۔

لہٰذا ایک حقیقی داعی دعوت و تبلیغ کے دوران کسی ایسے رشتہ اور تعلق کو خاطر میں نہیں لاتا جو اس کے مشن اور مقصد میں رکاوٹ بنے اس کی جان' مال و دولت' رشتہ داریاں' مقام و منصب' صلاحیت و استعداد' زبان و قلم' افکار و تصورات غرض اس کی کل متاعِ حیات مقصد و ہدف پر فدا ہونے کے لیے تیار ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے۔

"یا ایھا الذین امنوا لا تتخذوا اٰبائکم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان و من یتولھم منکم فاولئک ھم الظالمون۔ قل ان کان اباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم وازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔

"اے ایمان لانے والو تم اپنے باپ داداؤں کو اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو دوست رکھتے ہوں اور جو تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہی تو ظالم ہے (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بی بیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے جمع کر لیے ہیں اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو۔ اور وہ مکانات جو تم پسند کرتے ہو (یہ سب چیزیں) اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ پیاری ہیں تو (جس حالت میں ہو رہو۔) یہاں تک کہ اللہ اپنے امر کو ظاہر کرے۔" (سورۂ توبہ ۹ آیت ۲۳۔ ۲۴)

آیہ شریفہ ہرگز اس مقصد کی دلیل نہیں ہے کہ مومن اور داعیٔ اسلام کو مذکورہ چیزوں سے کلیتاً پرہیز کرنا چاہیے۔ اور ہر صورت میں ان سے جدائی اختیار کرکے تمام مادی رشتوں کو قطع کر دینا چاہیے۔ نہیں بلکہ ایک مردِ مومن، مجاہد فی سبیل اللہ اور داعیٔ اسلام کی زندگی کے بھی وہی تقاضے ہیں جو ایک عام انسان کی زندگی کے ہیں۔ ہاں فرق یہ ہے کہ ایک دنیا پسند اور مادہ پرست انسان کے سامنے ارفع مقاصد اور اعلیٰ اہداف کی کوئی قدرو قیمت نہیں وہ اسی مادی کائنات کا اسیر ہے اور اعلیٰ روحانی مقاصد کے لیے دنیاوی رشتوں اور مادی آسائشوں کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں جب کہ ایک مومن اور اصلاح معاشرہ و دعوتِ دین کے لیے سرگرم مردِ مسلمان ایسے مواقع پر نہ

صرف دنیاوی رشتوں کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ اپنے مقصد کی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اپنی جان بھی اس راہ میں فدا کر دیتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے۔

"و من الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونہم کحب اللہ و الذین امنوا اشد حبا للہ"

"اور آدمیوں میں سے ایسے (بھی) ہیں جو خدا کو چھوڑ کر اوروں کو (اس کے) ہمسر بناتے ہیں اور ان سے خدا کی سی محبت رکھتے ہیں اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت خدا ہی سے ہے۔"

(سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۶۵)

اس مضمون کے حوالے سے بکثرت روایات فریقین کی کتب میں ملتی ہیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ

"لا یمحض رجل الایمان با اللہ حتی یکون اللہ احب الیہ من نفسہ و ابیہ وامہ وولدہ و اھلہ ومالہ ومن الناس کلھم"

"کسی آدمی کا ایمان اس وقت تک خالص نہیں ہوتا جب تک اس کے پاس اللہ تعالیٰ اپنی جان والدین، اولاد، اہل و عیال، دولت و ثروت اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو۔"

(بحار الانوار ج ۷۰ ص ۲۵۔ میزان الحکمہ ج ۲ ص ۲۱۲)

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ و الناس اجمعین۔"

"تم میں سے کسی کا ایمان درست نہیں ہوتا جب تک اس کے پاس میرا مقام اس کے باپ بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو"

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۰)

بے شک ایمان، عملِ صالح اور جہاد فی سبیل اللہ سے روکنے اور باز رکھنے کے یہی وہ حربے ہیں جنہیں خود کو انسان کا خیر خواہ ظاہر کر کے شیطان نہایت موثر طریقے سے استعمال کرتا ہے۔ایک روایت کا مضمون ہے۔

"جب شیطان کسی شخص کا رجحان اسلام اور ایمان بہ خدا کی جانب دیکھتا ہے تو اسے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش شروع کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ "کیا تم اپنے آبا و اجداد اور قوم و قبیلہ کے مذہب کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرنا چاہتے ہو؟" اگر کوئی اس کے باوجود اسلام قبول کرے تو شیطان اسے جہاد فی سبیل اللہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "کیا تم جہاد کے لیے نکل رہے ہو؟ ارے اس میں تو جانی اور مالی نقصان کا خطرہ ہے۔ اگر تم مارے گئے تو تمہاری بیوی کسی اور کے ساتھ بیاہ دی جائے گی تمہارا مال و دولت لوگ آپس میں بانٹ لیں گے۔" اگر کوئی شیطان کی کھڑی کی ہوئی ان رکاوٹوں کو عبور کر کے جہاد کے لیے نکل کھڑا ہو اور راہ خدا میں جان نثار کر دے تو خداوند عالم پر لازم ہے کہ اسے جنت فردوس عطا فرمائے۔"

ان فدا کاریوں کی بدولت، اس جان نثاری کے ذریعے طالب کمال، کمال کے بلند ترین درجات پر فائز ہوتا ہے۔ اور مجاہد فی سبیل اللہ کے اعلیٰ ترین رتبے کو حاصل کرتا ہے۔ سورہ توبہ میں ارشاد قدرت ہے۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون و عدا علیہ حقا فی التورات و الانجیل و القران و من اوفیٰ بعھدہ من اللہ فاستبشر وابیعکم الذی بایعتم بہ وذالک ھو الفوز العظیم۔"

"بے شک اللہ نے صاحبانِ ایمان سے ان کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے کہ یہ لوگ راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور پھر خود بھی قتل ہوجاتے ہیں۔ یہ وعدۂ برحق توریت، انجیل اور قرآن ہر جگہ ذکر ہوا ہے اور خدا سے زیادہ اپنے

عہد کو پورا کرنے والا کون ہوگا تو اب تم لوگ اپنی اس تجارت پر خوشیاں مناؤ جو تم نے خدا سے کی ہے کہ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

(سورۂ توبہ ۹ آیت ۱۱۱)

۳۔ غیر خدا سے خوف نہ کھانا

داعیٔ اسلام کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ حکمِ خدا کی نشرو اشاعت، دعوت و تبلیغ اور پیغامِ الٰہی کی ترویج و نفاذ ہی اس کا نصب العین ہوتا ہے۔

"الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ و لا یخشون احدا الا اللہ"

"وہ جو خدا کا حکم پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے" (سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۳۹)

"الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون"

"آج کے دن کافر تمہارے دین سے مایوس ہوگئے پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔" (سورۂ مائدہ ۵ آیت ۳)

"یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ و اللہ یعصمک من الناس"

"اے رسولؐ جو کچھ تمارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم نے اس کی رسالت نہ پہنچائی۔ اور خدا لوگوں کے شر سے تمہیں محفوظ رکھے گا۔"

(سورۂ مائدہ ۵ ۔ آیت ۶۷)

"یجاھدون فی سبیل اللہ و لا یخافون لومتہ لائم"

"راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔" (سورۂ مائدہ ۵ آیت ۵۴)

۴۔ استقامت

مبلغِ اسلام کی اہم ترین صفات میں سے ایک صفت استقامت اور ثباتِ قدم ہے۔ داعیانِ دین کو اپنے فریضے کی انجام دہی کے دوران طرح طرح کے مصائب اور کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ فریضہ جس قدر نازک' جتنا اہم اور جس قدر افضل ہے اسی قدر مشکل' کٹھن اور جاں کاہ بھی ہے۔ یہاں قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مصائب جھیلنے پڑتے ہیں اور نامرادیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

رفاہ و آسائش کے بجائے جاں گزار مشکلات سہنی پڑتی ہیں۔ قدموں میں پھول نہیں بکھیرے جاتے' راہ میں کانٹے ڈالے جاتے ہیں' تحسین و آفرین کی بجائے سخت سست سننا پڑتی ہے۔ عزت و تکریم کے بجائے بے عزتی اور حقارت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

غرض دعوتِ دین اور اصلاحِ امت کی راہ میں قدم اٹھانا اپنے آپ کو مصائب و مشکلات کی چکی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس راہ کو جاری رکھنے کے لیے ثابت قدمی اور استقامت اولین شرائط میں سے ہے۔ چنانچہ داعیانِ دین میں ایسے کم ہمت افراد بھی ملتے ہیں جو ان مصائب و مشکلات سے ہار کر راستے ہی میں تھک کر ایک طرف بیٹھ جاتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ہم کیوں مصیبتیں مول لیں' کیوں اپنے مفادات خطرے میں ڈالیں' اصلاح معاشرہ اور تبلیغ دین کا ہم نے ٹھیکہ تھوڑی لے رکھا ہے' آخر اور لوگ بھی تو ہیں وہ کیوں اپنا فرض ادا نہیں کرتے۔ رہی انبیا اور ائمہ کی بات تو وہ تو معصوم تھے' صاحبِ کرامات تھے اور خدا نے انہیں بہت صبر اور حوصلے سے نوازا تھا' ہم ان کی برابری کیسے کر سکتے ہیں۔

ان بہانہ باز اور کم حوصلہ افراد کے برعکس ایسے مومن' متقی' پرعزم اور اپنی زندگی کو دعوت و تبلیغ دین کے لیے تج دینے والے افراد کی بھی کمی نہیں جن کے موقف میں مذکورہ بالا تمام شدائد و مشکلات بلکہ ان سے بھی زیادہ مصائب جھیلنے کے باوجود ذرہ برابر تبدیلی نہیں آتی بلکہ جوں جوں مشکلات بڑھتی جاتی ہیں ان کا عزم و حوصلہ فزوں تر ہوتا

جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ اپنے مشن کی تکمیل اور کامیابی کے ساتھ اس کی پیش رفت کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی خصوصیت قران کریم میں یوں بیان ہوئی ہے۔

"الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ"

"اور وہ لوگ اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور دل میں اس کا خوف رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔" (سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۳۹)

"الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوالکم فلخشوھم فزادھم ایمانا.و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل"

"یہ وہ ایمان والے ہیں کہ جب ان سے بعض لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے لیے عظیم لشکر جمع کر لیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے خدا کافی ہے اور وہی سب سے اچھا کارساز ہے۔" (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۷۳)

خداوندِ عالم رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو استقامت اور ثابت قدمی کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"فلذالک فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھوائھم"

"لہٰذا آپؐ اسی کے لیے دعوت دیں اور اس طرح استقامت سے کام لیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کا اتباع نہ کریں۔" (سورۂ شوریٰ ۴۲ آیت ۱۵)

"فلستقم کما امرت و من تاب معک و لا تطغوا"

"لہٰذا آپ کو جس طرح حکم دیا گیا ہے اسی طرح استقامت سے کام لیں اور وہ بھی جنہوں نے آپ کے ساتھ توبہ کرلی ہے اور حد سے زیادہ

نہ بڑھو" (سورۂ ہود ۱۱ آیت ۱۱۲)

"فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت اذ نادیٰ و ھو مکظوم۔"

"اب آپ اپنے پروردگار کے حکم کے بارے میں صبر کریں اور صاحبِ حوت (حضرت یونس) جیسے نہ ہو جائیں جب انہوں نے نہایت غصہ کے عالم میں آواز دی تھی۔" (سورۂ قلم ۶۸ آیت ۴۸)

رسولِ مقبولؐ دعوت اور تبلیغ کے میدان میں صبر و ثبات اور عزم و استقامت کا مثالی نمونہ تھے چنانچہ جب قریش نے تجویز پیش کی کہ آپؐ دعوتِ اسلام سے ہاتھ کھینچ لیں تو آپؐ نے فرمایا۔

"یا عم و اللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ او اھلک فیہ ما ترکتہ"

"اے چچا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تو پھر بھی میں خدائی مشن سے دستبردار نہ ہوں گا۔ یہاں تک کہ میں خود جان دے دوں یا خدا اسے غالب کردے۔" (سیرۃ مصطفیٰ ص ۱۵۲۔ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۸۵۔ تاریخ طبری ج ۱ ص ۵۴۵)

قرآن کریم متعدد مقامات پر اپنے عقیدے پر محکم اور ثابت قدم رہنے والے صاحبانِ ایمان کی تعریف و تمجید فرماتا ہے۔

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکتہ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنتہ التی کنتم توعدون۔"

"بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اسی پر ثابت قدم رہے تو ان پر فرشتے یہ پیغام لے کر نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور رنجیدہ بھی نہ ہو اور اس جنت سے مسرور ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے۔" (سورۂ فصلت ۴۱ آیت ۳۰)

"ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

اولئک اصحاب الجنۃ خالدین فیہا جزاء بما کانوا یعملون۔"

"بے شک جن لوگوں نے اللہ کو اپنا رب کہا اور اس پر ثابت قدم رہے۔ ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہونے والے ہیں۔ یہی لوگ درحقیقت جنّتی ہیں اور جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں کہ یہی ان کے اعمال کی حقیقی جزا ہے۔"

(سورۂ احقاف ۴۶ آیت ۱۳۔ ۱۴)

عاشقِ خدا، مقصدِ حیات کا مبلغ، ایمان و عقیدے سے سرشار مومن اپنے اصولی موقف سے ذرہ برابر بھی دست بردار نہیں ہوتا اور اپنی منزلِ عشق تک پہنچنے کے لیے اپنی ذات تک کو فراموش کر دیتا ہے اور یہ اس بات کی صحیح علامت ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو اچھی طرح جان لیا ہے۔ دعوت الیٰ الحق کے فریضے کی اہمیت سے آگاہ ہے اور اس کے خلاف ہونے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ خدا کے حصول کی لگن، حکم خدا کی تعمیل میں سرگرمی اور منصبِ خلافت الٰہیہ کے اہم فریضہ کی بجا آوری کا واضح ثبوت پیش کر رہا ہے۔

۵۔ اظہار حق

مبلغ اور داعی کو یہ اہم بات پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ دورانِ دعوت بحث و مناظرہ کا مقصد مقابل کو مغلوب کرنا یا اسے لاجواب کر دینا نہ ہو اور اسی طرح خطابت کے دوران بھی یہ ملحوظ رہے کہ اس کا مقصد زورِ بیان اور رعبِ علم کے ذریعہ نام و نمود اور شہرت کی طلب نہ ہو بلکہ بحث و گفتگو کا مقصد مخاطب کو راہ راست دکھانا اور عقل، شرع اور منطق کے ذریعے اسے قانع کرنا ہو۔

اسلامی تعلیمات اور فرامینِ معصومینؑ میں ایسے علماء کی مذمت ہوئی ہے جو فخرو مباہات کے اظہار، مقابل کو مسحور کرنے اور نام و نمود کے لیے علم حاصل کرتے ہیں۔ امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے۔

".........و ایاکم ان تطلبوہ لخصال اربعۃ: لتباھوا بہ العلماء اوتمار وابہ السفہاء' اوترا وبہ فی المجالس' اوتصرفوا بہ وجوہ الناس الیکم للترؤس۔"

"علم و معرفت ان چار خصلتوں کے حصول کے لیے حاصل کرنے سے پرہیز کرتے رہنا۔ علماء سے فخر و مباہات کی خاطر۔ نادانوں کو قوتِ جدال سے مسحور کر دینے کی غرض سے۔ مجالس و محافل میں خود نمائی کے لیے اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے واسطے تاکہ ان پر اپنی آقائی جما سکو۔"

(الحیاۃ جلد ۲ ص ۳۳۰)

یہی روایت مختلف الفاظ کے ساتھ حضرت رسول مقبولؐ اور حضرت امام محمد باقرؑ سے بھی مروی ہے (منیتہ المرید ص ۴۳ اصولِ کافی ج ۱ ص ۴۷)

لہٰذا مبلغِ اسلام کو فخر و مباہات جتانے' علمی رعب بٹھانے' مخاطب کو لاجواب کر دینے جیسے خیالات کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے بلکہ ہمیشہ اظہارِ حق' غلبۂ اسلام' ہدایتِ خلق اور دین کی جانب سے عائد کردہ فریضۂ تبلیغ کی انجام دہی کا جذبہ غالب ہونا چاہیے۔

"ان ارید الا الاصلٰح ما استطعت۔"

"مجھ سے جہاں تک ممکن ہو میں تو اصلاح ہی چاہتا ہوں۔"

(سورۂ ھود ۱۱ آیت ۸۸)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"اللھم انک تعلم انہ لم یکن الذی کان منا منافستہ فی سلطان ولا التماس شیئی من فضول الحطام و لکن لنرد المعالم من دینک و نظہر اصلاح فی بلادک فیامن المظلومون من عبادک و تقام العطلتہ من

حدودک"

"بارالہا تو خوب جانتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہم سے (جنگ و پیکار کی صورت میں) ظاہر ہوا ہے اس لیے نہیں تھا کہ ہمیں تسلط و اقتدار کی خواہش تھی یا مالِ دنیا کی طلب تھی بلکہ یہ اس لیے تھا کہ ہم دین کے نشانات کو (پھر ان کی جگہ پر) پلٹائیں اور تیرے شہروں میں امن و بہبود کی صورت پیدا کریں تاکہ تیرے ستم رسیدہ بندوں کو کوئی کھٹکا نہ رہے اور تیرے وہ احکام پھر سے جاری ہو جائیں جنہیں بیکار بنا دیا گیا ہے۔" (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۰)

۶۔ خود سازی

کردار اور اعمال کے ذریعہ دعوت، اقوال اور گفتار سے دی جانے والی دعوت سے کہیں زیادہ اثر رکھتی ہے۔ لہٰذا معاشرہ کی اصلاح کے خواہشمند اور اس اہم فریضہ کے لیے سرگرمِ عمل افراد کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ خود سازی اور تعمیرِ ذات کو تمام دوسرے امور پر مقدم رکھیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی تعمیل کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ان باتوں سے انسان خود بھی پرہیز کرے جن سے باز رہنے کی دوسروں کو تلقین کر رہا ہے۔

ارشاد قدرت ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوالم تقولون ما لا تفعلون کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔"

"اے ایمان والو جو کرتے نہیں وہ منہ سے کہتے کیوں ہو؟ خدا کے نزدیک یہ بات حد سے زیادہ ناپسندیدہ ہے کہ منہ سے جو کچھ کہتے ہو اس پر عمل نہ کرو۔" (سورۂ صف ۶۱ آیت ۲ ۔۳)

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

"من نصب نفسہ للناس اماما فلیبدا بتعلیم نفسہ قبل تعلیم غیرہ ولیکن

تادیبہ بسیرتہ قبل تادیبہ بلسانہ و معلم نفسہ و مودبھا احق بالاجلال من معلم الناس و مودبھم۔"

"جو لوگوں کا پیشوا بنتا ہے تو اسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے آپ کو تعلیم دینا چاہیے اور زبان سے درسِ اخلاق دینے سے پہلے اپنی سیرت و کردار سے تعلیم دینا چاہیے اور جو اپنے نفس کی تعلیم و تادیب کر لے، وہ دوسروں کی تعلیم و تادیب کرنے والے سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔" (نہج البلاغہ کلمات قصار نمبر ۷۳)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے شیعوں کو بطور خاص یہی ہدایت فرماتے ہیں کہ

"ان تکونو الارعاہ حامینن"

"تم ہمارے لیے خاموش داعی بنو"

(الامام الصادقؑ و مذاہب اربعہ ج ۲ ص ۳۱۹)

یعنی محض باتوں سے نہیں بلکہ اپنے بہترین سیرت و کردار کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کی جائے اور یہ زیادہ موثر طریقۂ دعوت ہے۔

ایک اور مقام پر آپؑ فرماتے ہیں۔

"کونو ادعاۃ للناس بغیر السنتکم لیرو امنکم الورع والاجتہاد والصلاح و الخیر۔"

"تم اپنی زبان کے بغیر "کردار سے" لوگوں کو دعوت دو۔ کیونکہ جب وہ تم سے ورع و تقویٰ، جدو جہد، اقامۂ نماز اور خیر و خوبی کا مشاہدہ کریں گے تو تمہارے یہی اعمالِ صالحہ ان کی رہنمائی کا سبب بنیں گے۔"

(وسائل الشیعہ ج ۱۱ ص ۱۹۴)

۷۔ تعمیری تنقید

داعیٔ دین اور مبلغِ اسلام کو لوگوں کی تنقید کا نہایت خنداں پیشانی اور فراخ دلی سے

استقبال کرنا چاہیے کیونکہ تعمیری تنقید اصلاحِ ذات' تعمیرِ کردار' اور کام کو بہترین طریقے سے انجام دینے کے سلسلہ میں نہایت موثر کردار ادا کرتی ہے بلکہ دینی تعلیمات تو اس بات کی تاکید کرتی ہیں کہ انسان کو گاہے بگاہے خود اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور دوسروں کی تنقید سے قبل خود اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

رسول اکرمؐ نے ابوذر غفاریؓ سے فرمایا۔

.....اے ابوذر اپنے نفس کا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے کیونکہ یہ کام تیرے کل کے حساب کو آسان تر کردے گا اپنے نفس کو (اعمال کے ترازو میں) تولو قبل اس کے کہ اسے تولہ جائے اے ابوذر کسی آدمی کا شمار پرہیزگاروں میں نہیں ہو گا۔ مگر یہ کہ خود اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ شریک کا محاسبہ شریک سے بہت سخت ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے لیے کھانے' پینے' پہننے کی اشیاء کہاں سے فراہم ہوتی ہیں آیا حرام سے ہیں یا حلال سے؟ (وسائل شیعہ ج ۱۱ ص ۳۷۹ ۔ بحار الانوار ج ۷۷ ص ۸۳ ۔ الحیاۃ ج ۱' ص ۴۱۹)

حضرت امیر المومنینؑ سے دریافت کیا گیا۔ مولا اپنے نفس کا محاسبہ کیسے کیا جائے؟ فرمایا کہ جب دن گزر جائے تو اپنے آپ سے کہے اے نفس یہ دن تجھ سے بچھڑ چکا ہے پھر لوٹے گا نہیں! خدا تجھ سے پوچھے گا کہ تو نے یہ دن کیسے گزارا ہے۔ اور اس دن کیا عمل کیا ہے؟ کیا خدا کی یاد کی اور اس کی حمد بیان کی۔ آیا آج کے دن کسی برادرِ مومن کی حاجت روائی کی؟ آیا کسی غمگین اور پریشان شخص کی پریشانی کو دور کیا؟ آیا اس کی غیر حاضری میں اس کی آبرو اور اہل و عیال کی حفاظت کی؟ کیا برادرِ مومن کی وفات کے بعد اس کے پسماندگان کی خبر گیری کی؟ کیا مومن کی غیبت کرنے سے اجتناب برتا؟ کیا کسی مسلمان بھائی کی مدد

کی؟ وغیرہ وغیرہ .....

پس اس وقت اسے وہ تمام باتیں یاد آئیں گی جو اس نے کی تھیں۔ اب دیکھے گا کہ اگر اس نے نیکیاں کی تھیں تو خدا کی عطا کردہ توفیقات پر حمد بجا لائے اگر اسے معصیت اور کوتاہی یاد آجائے تو خدا سے مغفرت طلب کرے اور دوبارہ گناہ میں مبتلا نہ ہونے کا پکا ارادہ کرے۔"

(وسائل ج ۱۱ ص ۳۷۹۔۳۸۰۔ الحیاۃ ج ۱ ص ۴۲۰)

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"لیس منا من لم یحاسب نفسہ فی کل یوم فان عمل حسنا استزاد اللہ وان عمل سیتا استغفر اللہ منہ و تاب الیہ"

"جو شخص ہر روز اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ اگر اعمالِ صالحہ انجام دیے ہوں تو اللہ تعالیٰ سے مزید توفیق طلب کرے اور اگر اعمالِ بد کا مرتکب ہوا ہو تو خدا سے استغفار طلب کرے۔" (اصول کافی ج ۲ ص ۳۲۸۔ وسائل شیعہ ج ۱۱ ص ۳۷۷)

۸۔ انکساری

مبلغِ اسلام کی لازمی صفات میں تواضع و انکساری بھی شامل ہے اسی لیے داعیٔ دین میں تکبر اور خود نمائی کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں بکثرت آیاتِ قرآن اور روایاتِ معصومینؑ موجود ہیں جن میں سے چند ایک بطورِ نمونہ حاضرِ خدمت ہیں۔

قرآن کریم میں ارشادِ قدرت ہے۔

"و اخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین"

"اور جو صاحبان ایمان آپ کا اتباع کرلیں ان سے انکساری سے پیش آؤ۔" (سورۂ شعراء ۲۶ آیت ۲۱۵)

"و عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض هونا و اذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلٰما۔"

"اور اللہ کے بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو وہ انہیں سلامتی کا پیغام دے دیتے ہیں۔" (سورۂ فرقان ۲۵ آیت ۶۳)

"تلک الدار الاخرة نجعلها للذین لایریدون علوا فی الارض و لافسادا والعاقبته للمتقین۔"

"یہ دارِ آخرت وہ ہے جسے ہم ان لوگوں کے لیے قرار دیتے ہیں جو زمین میں نہ تکبر کرتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں اور عاقبت تو صرف متقین کے لیے ہے۔" (سورۂ قصص ۲۸ آیت ۸۳)

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا۔

"میری ایک حاجت ہے اسے پورا کرو۔" انہوں نے کہا "اے روح اللہ ہم ضرور آپ کی حاجت پوری کریں گے۔" پس حضرت عیسیٰؑ اٹھے اور ان کے پیر دھونے لگے۔ انہوں نے کہا "اے روح اللہ یہ کام تو ہمارے لیے زیادہ زیبا تھا اور ہم اس خدمت کے زیادہ حقدار تھے۔" فرمایا! "میں نے ازراہِ تواضع یہ عمل انجام دیا ہے تاکہ میرے بعد تم لوگ بھی اسی طرح فروتنی اختیار کرو۔" پھر فرمایا "تواضع و فروتنی سے حکمت حاصل ہوتی ہے نہ کہ تکبر سے جس طرح ہموار زمین میں نباتات اگتے ہیں بنجر اور سخت پہاڑوں میں نہیں۔" (اصول کافی ج ۱ ص ۲۹)

لہٰذا داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے سامنے کسی قسم کی برتری اور فوقیت کا اظہار نہ کرے اور مدعو کو احساسِ کمتری اور کم مائیگی محسوس نہ ہونے دے۔

دوسرے الفاظ میں خود کو دوسروں پر مسلط نہ کریں بلکہ ان کا نکتہ نظر نہایت انہماک اور دلچسپی سے سنیں۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ آپ ان کے خیرخواہ ہیں اور ان کو مشکلات سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔

اس طرزِ عمل سے روابط و تعلقات میں استحکام پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں تبلیغ اسلام اور دعوت و اصلاح کے بہتر سے بہتر مواقع میسر آئیں گے۔

"فبما رحمته من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لا نفضوا من حولكـ"

"پیغمبر! یہ خدا کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو ورنہ اگر تم بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔" (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۵۹)

خوش رفتاری، خوش گفتاری، اخلاقِ حسنہ اور تواضع و فروتنی سے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور دشمنوں کی تعداد کم کی جاسکتی ہے۔ نا صرف یہ بلکہ خداوندِ عالم کے نزدیک بھی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے نیز یہ ہر دل عزیزی اور محبوبیت تبلیغِ اسلام اور دعوتِ دین کے موقع پر بھی نہایت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

۹۔ لوگوں سے مادی توقع نہ رکھنا

مبلغ اسلام کو دوسروں سے کسی قسم کی مادی توقعات وابستہ نہیں رکھنا چاہئیں۔ حتیٰ ان سے اپنے احترام و تکریم کا طالب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ توقعات اخلاص اور للّٰہیت کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ دعوت و تبلیغ کی رفتار اور اس کی بقا و دوام میں بھی خلل کا باعث ہوتی ہیں۔

چنانچہ تمام انبیاء کرامؑ کی سنت یہی رہی ہے کہ انہوں نے کبھی دعوت و تبلیغ کی راہ میں اٹھائی گئی زحمتوں اور برداشت کی گئی تکلیفوں کا اجر نہیں مانگا۔

"قل لا اسئلكم عليه اجرا الا المودة فى القربىٰـ"

"کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس تبلیغِ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا علاوہ

اپنے اقرباء کی مودت کے۔" (سورۂ شوریٰ ۴۲ آیت ۲۳)

"وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العالمین"

"اور میں اس تبلیغ کی کوئی اجرت بھی نہیں چاہتا ہوں میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔" (سورۂ شعرا ۲۶ آیت ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰)

"یا قوم لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی الذی فطرنی افلا تعقلون۔"

"قوم والوامیں تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا میرا اجر تو اس پروردگار کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے کیا تم عقل استعمال نہیں کرتے ہو۔" (سورۂ ہود ۱۱ آیت ۵۱)

"ویا قوم لا اسئلکم علیہ مالا ان اجری الا علی اللہ"

"اے قوم میں تم سے کوئی مال تو نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔" (سورۂ ہود ۱۱ آیت ۲۹)

داعیٔ دین کو ہر وقت یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے وجود اور اس کے عمل سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے اگر اسے تبلیغ دین کے مواقع میسر ہوں تو اسے دوسری تمام چیزوں کو ثانوی حیثیت دینی چاہیے، یعنی اس کا نصب العین اور مقصد و مدعا صرف پیغامِ الٰہی کی تبلیغ اور اپنی سنگین ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہو۔

۱۰۔ فراخ دلی کا مظاہرہ

ایک اچھے داعی کی صفات میں فراخ دلی بھی شامل ہے۔ ذاتی معاملات اور انفرادی امور میں فراخ دلی، وسیع النظری اور شفقت و محبت، دعوت و تبلیغ کی وسعت اور قوت میں اضافے کا سبب ہوتی ہیں۔ آیت قرآن ہے۔

"خذا لعفو و امر بالعرف و اعرض عن الجاھلین۔"

"آپ عفو کا راستہ اختیار کریں نیکی کا حکم دیں اور جاہلوں سے کنارہ

کشی کریں۔" (سورۂ اعراف ۷ آیت ۱۹۹)

"قال الملا من قومہ انا لنراک فی ضلال مبین قال یا قوم لیس بی ضلالۃ ولٰکنی رسول من رب العالمین ابلغکم رسالات ربی وانصح لکم و اعلم من اللہ مالا تعلمون۔"

"تو قوم کے رؤسا نے جواب دیا کہ ہم تم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں۔ نوحؑ نے کہا اے قوم مجھ میں گمراہی نہیں ہے بلکہ میں رب العالمین کی جانب سے بھیجا ہوا نمائندہ ہوں میں تم تک اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ سب جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" (سورۂ اعراف ۷ آیت ۶۰، ۶۱، ۶۲)

خیال رہے کہ فراخ دلی کے مظاہرہ کی یہ تعلیم ان امور کے بارے میں ہے جو اصولِ دین، روحِ اسلام، احکامِ قرآن اور شریعت پر منفی اثرات مرتب نہ کرتے ہوں اور احکامِ الٰہی کے اجراء و نفاذ کی راہ میں حائل نہ ہوتے ہوں۔ داعیٔ اسلام کو کسی صورت میں یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کو خوش کرنے اور تواضع و مدارات کی خاطر اسلامی تعلیمات اور شرعی احکام سے چشم پوشی کرے۔

"محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم"

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت ترین اور آپس میں انتہائی رحم دل ہیں۔" (سورۂ فتح ۴۸ آیت ۲۹)

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ داعیٔ اسلام، دین کی تبلیغ، پیغام الٰہی کی ترویج اور دعوت کی وسعت کی خاطر دشمنان اسلام اور خلاف دین نظریات کے حامل افراد سے نرم اور لچک دار موقف اپنانا چاہتا ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ایک واقعہ رسولِ مقبولؐ کی حیاتِ طیبہ میں بھی پیش آیا جب کہ

قریش نے آپؐ کے سامنے تجویز رکھی کہ۔

"آپ ہمارے خداؤں کو برا کہنا چھوڑ دیں، ہمیں کم عقل کہنے سے باز آجائیں اور (دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے) ان حقیر غلاموں کو اپنے سے دور کردیں کہ جن سے ہمیں بدبو آتی ہے تاکہ ہم آپ کی مجلس میں حاضر ہوں اور آپ کی باتیں سنیں۔"

اس امید پر کہ شاید یہ لوگ مسلمان ہوجائیں۔ رسول اللہؐ نے سوچا کہ (چاہے وقتی طور پر ہی سہی) ان کی بات مان لی جائے۔ مگر خداوند عالم نے شدید الفاظ میں اپنے محبوبؐ کو اس قسم کا اندازِ تبلیغ اختیار کرنے سے منع فرمایا۔ اور آیت نازل ہوئی۔

"ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا اذا لا ذقناک ضعف الحیاۃ و ضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیرا۔"

"اور اگر ہماری توفیقِ خاص نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہوجاتے اور پھر ہم زندگانیٔ دنیا اور موت دونوں مرحلوں پر دہرا مزہ چکھاتے اور آپ ہمارے خلاف کوئی مددگار اور کمک کرنے والا بھی نہ پاتے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷ آیت ۷۴، ۷۵)

آیت کی شانِ نزول کے مطابق ان شرائط کی پہلی شق یعنی بتوں کو برا بھلا نہ کہنا پیغام ربانی کے خلاف نہ تھا جب کہ ان کی باقی شرائط قرآنی تعلیمات کے منافی تھیں۔

اسی طرح اس مسئلہ میں خداوندِ عالم کی نہی اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ رسول کریمؐ سے عصمت کے منافی کوئی فعل سرزد ہوا یا آپ نے ایسا کوئی ارادہ کرلیا ہے۔[1]

ا (ا) دراصل آنحضرتؐ سے کوئی فعل سرزد نہ ہوا تھا حتیٰ کہ آپؐ کا قلبی میلان بھی نہ تھا کیونکہ خداوند عالم نے آپؐ کو ثابت قدم رکھا۔ یعنی اگر خداوند عالم کی یہ خاص عنایت شامل حال نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ آپؐ کے موقف میں لچک آجاتی اور آپ کا قلبی میلان اس جانب ہوجاتا۔

جیسا کہ اہل ادب کہتے ہیں کہ حضرت عمر کی زبان سے بارہا ادا ہونے والے جملے "لولا علی لھلک عمر" میں حضرت عمر ہلاکت کا شکار اس لیے نہ ہوئے کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام موجود تھے۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی حضورؐ کے کفار کی جانب میلان اور ان کی تجویز مان لینے کے معنی بھی اس لیے حاصل نہیں ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ثابت قدم رکھا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر فخر الدین رازی ج ۲۱ ص ۲۲، تفسیر کاشف ج ۵ ص ۷۱۔"

اس کے باوجود اس امکانی اسلوب میں مندرجہ ذیل منفی پہلو پوشیدہ تھے۔

اوّل

اگر بفرضِ محال رسول مقبولؐ مشرکین کی جانب سے پیش کردہ بعض تجاویز قبول فرما بھی لیتے (جیسا کہ ظاہر ہے مشرکین کی تمام تجاویز تو اس قابل بھی نہ تھیں کہ انہیں ایک عام مسلمان قبول کرے چہ جائیکہ مبلغِ اعظم رسولِ کریمؐ ان تجاویز کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں) تو اس کے بعد بھی کیا ضمانت تھی کہ مشرکین اپنے موقف میں لچک پیدا کرلیتے اور حسبِ وعدہ آیاتِ قرآنی سنتے۔

مکار اور فریبی دشمنوں کا یہی وتیرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی غرض کے حصول کے لیے چاپلوسی اور خوش کن وعدوں کا سہارا لیتے ہیں لیکن جوں ہی ان کا مقصد پورا ہوجاتا ہے یک بیک ان کا رویہ برعکس ہوجاتا ہے چنانچہ سورۂ کافرون میں بھی کفار کی تقریباً ایسی ہی ایک تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنا وعدہ وفا کرنے والے نہیں۔

دوّم

اگر ابتدائے دعوت ہی میں یہ لچک دار موقف اختیار کرلیا جاتا تو اس مثال سے رہتی دنیا تک استفادہ کیا جاتا اور منافقین اور دعوت دین کے ابن الوقت دعویدار دین کے ہر اصول و نظریہ کو قدموں تلے روند ڈالتے اور رفتہ رفتہ پورے کا پورا دین اور اس کے تمام نظریات و اصول مصلحت اندیشی کا شکار ہو کر اپنی حقیقی ماہیت کھو بیٹھتے۔

اس راہ کو ابتداء ہی میں بند کر دینے کی خاطر خدا نے اس کا آغاز اپنے رسولؐ ہی

سے کیا تاکہ تاقیامِ قیامت یہ بات روشن رہے کہ اگر اسلامی اصول و نظریات اور دین کے احکام و قوانین کے خطرے میں پڑ جانے کا امکان ہو تو فراخ دلی' نرم روی اور لچک دار رویہ اختیار کرنا جائز نہیں۔

۱۱۔ نظام الاوقات

دعوت و تبلیغ کی وسعت اور میسر وقت سے زیادہ سے زیادہ استفادے کی خاطر داعی کے لیے ضروری ہے کہ اپنے روز مرہ معمولات کے لیے نظام الاوقات وضع کرے اور ذاتی امور کی انجام دہی اور دعوتی معاملات نمٹانے کے لیے علیحدہ علیحدہ وقت معین کرے۔

بعض لوگوں کو جب دعوتِ دین اور اصلاحِ معاشرہ کے سلسلے میں ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا جاتا ہے تو وہ تنگیٔ وقت کی شکایت کرتے ہیں اور اس الٰہی فریضے کی اہمیت و ضرورت کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "کیا کریں ہمیں وقت ہی نہیں ملتا وگرنہ اس کارِ ثواب کو انجام دینے کے لیے تو ہم بے چین ہیں۔"

اگر حقیقت نظری سے کام لیا جائے تو بات دراصل یہ نہیں ہے کہ ہمیں وقت کم میسر ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے امور انجام دینے کے لیے کوئی نظام الاوقات وضع نہیں کیا ہوا۔ اسی بنا پر ہم ہمیشہ عدیم الفرصتی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے اور ہر فرد اپنے اوقات یومیہ کو تقسیم کرے تو اکثر افراد کے لیے روزانہ چند گھنٹے اس الٰہی فریضے کی انجام دہی کے لیے نکالنا کوئی مشکل نہیں۔

بہرحال ایک مبلغ اور داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اوقات کو ترتیب دے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے روز مرہ امور انجام دے تاکہ اس کی ذاتی' خاندانی اور عائلی زندگی بھی خوشگوار گزرے اور دعوتِ دین اور اصلاح و تبلیغ کے میدان میں بھی وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکے۔

حضرت رسولِ مقبولؐ کا ارشاد ہے۔

"ہر عاقل انسان کو چاہیے کہ اپنے یومیہ اوقات کو چار حصوں میں

تقسیم کرے۔ ایک حصہ پروردگارِ عالم سے راز و نیاز اور اس کی پرستش و عبادت کے لیے مخصوص ہو۔ دوسرے حصے میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ تیسرا حصہ اسرارِ کائنات میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کے لیے مخصوص ہو اور چوتھے حصے میں خداوند عالم کی جانب سے حلال کی گئی اشیاء سے لذت حاصل کرے۔" (بحار الانوار ج ۷۷ ص ۷۱۔ ۷۲ منیتہ المرید ص ۱۲۷)

۱۲۔ باہمی تعاون

مبلغِ دین اور داعیٔ اصلاح کو ہر اس فرد، گروہ اور تنظیم کی جانب دستِ تعاون دراز کرنا چاہیے جو تبلیغ دین، اصلاح معاشرہ اور فکری و اجتماعی انقلاب کے لیے سرگرمِ عمل ہو۔

لیکن اگر ایسے فرد، گروہ یا تنظیم نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا ہو اور اس کے اسلوب میں ایسی خامیاں پائی جاتی ہوں جو دین و ملت کے لیے ضرر رساں ہوں اور جن سے انحراف کا اندیشہ ہو اور اصلاح کی کوشش کے باوجود وہ اس راہ اور اسلوب کو جاری رکھنے پر مصر ہوں تو ان سے ترکِ تعلق ہی بہتر ہے۔

۱۳۔ یاس و ناامیدی سے اجتناب

بعض افراد کچھ عرصہ مسلسل کام کرتے رہنے کے بعد حسبِ دلخواہ نتائج ظاہر نہ ہونے کی بنا پر مایوسی و ناامیدی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ زمانہ کی بے انصافی کا شکوہ کرتے ہیں، افرادِ معاشرہ کو مطعون قرار دیتے ہیں اور نہایت درشت لہجہ میں ان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اب ان میں راہ راست اختیار کرنے کی صلاحیت مفقود ہوچکی ہے، ان کا اخلاقی بگاڑ اور حق و صداقت سے گریز اس قدر پختہ ہوچکا ہے کہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی وہ قدرت نہیں رکھتے۔ ہاں اب ایک ہی چارہ ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم کوئی معجزہ دکھائے۔ اب یہ کام ہمارے دائرۂ قدرت سے باہر ہے اور ارشادِ قدرت بھی ہے

کہ۔

"لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا"

"اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔" (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۲۸۶)

لہٰذا معاشرہ کے عقیدے اور ایمان کی آلودگیوں کا ازالہ' اخلاقی انحراف اور روحانی امراض کی چارہ جوئی ہمارا کام نہیں بلکہ اس عظیم کام کی قدرت وہی ہستیاں رکھتی ہیں جنہیں خداوندِ عالم نے اپنی خاص عنایات کے ساتھ اس کام پر مامور کیا ہے' ہم جیسے کمزور اور بے وسیلہ افراد پر جو کسی قسم کی مخالفت اور دشمن کی معمولی سی یلغار کا مقابلہ کرنے کی بھی سکت نہیں رکھتے یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا۔

بعض افراد تو مختلف عوامل کی بنا پر مایوسی اور قنوطیت کا اس قدر شکار ہیں کہ اس میدان میں معمولی سے اقدام کے لیے بھی آمادہ نہیں اور حتیٰ اس عمل میں سرگرم افراد پر تنقید سے بھی گریز نہیں کرتے اور ان کی جدوجہد کو فضول اور وقت کا زیاں گردانتے ہیں۔

مومن پرامید ہوتا ہے

ایمان کی کمزوری' نفسانی امراض اور قوتِ ارادی کا ضعف ایسے بنیادی عوامل ہیں جو انسان کو اپنے ہدف' اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں ناامید بنا دیتے ہیں۔ مگر اسلامی تعلیمات اور قرآن کی صریح آیات ناامیدی اور قنوطیت کو نہ صرف گناہ شمار کرتی ہیں بلکہ بعض اوقات یہ خصلت کفر کے زمرے میں آتی ہے۔

"ولا تائیسوا من روح اللہ انہ لا یا ئیس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔"

"اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کہ اس کی رحمت سے کافروں کے علاوہ کوئی مایوس نہیں ہوتا۔" (سورۂ یوسف ۱۲ آیت ۸۷)

ایک مرد مومن بالعموم اور خاص کر ایک داعیٔ دین کسی بھی صورت میں مایوسی اور

ناامیدی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا۔ پرامیدی صحت مند مزاج، محکم ایمان اور مضبوط قوت ارادی کے مالک انسانوں کے خصائل میں سے ایک ہے اور امید ہی کے سہارے پر تمام مساعی انجام دی جاتی ہیں اور اسی پر مستقبل کی عمارت قائم ہے۔

"لولا الامل لضاع العمل"

"اگر امید و آرزو نہ ہوتی تو کسی انسان سے کوئی عمل سرزد نہ ہوتا۔"

امید و آرزو کے ساتھ عمل کی بجا آوری اسی وقت ممکن ہے جب انسان ایمان کی نعمت اور معنویت سے سرشار ہو۔ ساتھ ہی فریضۂ تبلیغ کی اہمیت کے احساس سے لبریز ہو۔

مبلغ اسلام کا نصب العین اور اس کی تمام جدوجہد کا محور اپنے الٰہی فریضے کی بجا آوری ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کسی جگہ فضا سازگار ہو، دعوت کی قبولیت کے زیادہ مواقع میسر ہوں۔ ظاہر ہے ایسی جگہ دعوت زیادہ تیزی سے پھیلے گی اور خاطر خواہ نتائج و ثمرات ظاہر ہوں گے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مقام پر فضا سازگار نہ ہو، دعوت کی قبولیت کے مواقع انتہائی قلیل ہوں ایسے مقام پر عمل کے نتائج انتہائی ست رفتاری سے سامنے آئیں گے۔ ان حالات میں مبلغ کو امید کا دامن مضبوطی سے تھامنے کی ضرورت ہے اور اس یقین کی ضرورت ہے کہ اس کا ذرہ برابر عمل اور معمولی سے معمولی مساعی رائیگاں نہیں جاسکتی۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ارشاد باری ہے۔

"والذین یمسکون بالکتاب و اقاموالصلا ۃ انا لا نضیع اجرالمصلحین۔"

"اور وہ لوگ جو کتاب کی پیروی کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ بے شک ہم بھی اصلاح کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کریں گے۔" (سورۂ اعراف ۷ آیت ۱۷۰)

"انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکرا و انثیٰ"

"پس خدا نے ان کی دعا کو قبول کیا (اور فرمایا) کہ میں تم میں سے کسی

بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔" (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۱۹۵)

"وان لیس للانسان الا ماسعی و ان سعیہ سوف یری ثم یجزیہ الجزاء الاوفی"

"اور انسان کے لیے صرف اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے اور اس کی کوشش عنقریب اس کے سامنے پیش کردی جائے گی اس کے بعد اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔" (سورۂ نجم ۵۳ آیت ۳۹۔ ۴۰۔۴۱)

"لاخیر فی کثیر من نجواھم الا من امر بصدقۃ او معروف او اصلح بین الناس و من یفعل ذالک ابتغا مرضات اللہ فسوف نوتیہ اجرا عظیما۔"

"ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہے مگر وہ شخص جو کسی صدقہ' کارِخیر یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے اور جو بھی یہ سارے کام رضاء الٰہی کی طلب میں انجام دے گا ہم اسے اجرِ عظیم عطا کریں گے۔" (سورۂ نساء ۴ آیت ۱۱۴)

۱۴۔ انتھک جدوجہد

انتھک جدوجہد اور بے تکان عمل کامیابی کے عوامل میں سے ایک ہے۔ ایک بار یا چند مرتبہ عمل کے بے نتیجہ اور غیر موثر ہوجانے کی بنا پر دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے' بلکہ تبلیغ کی حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بار بار اور مسلسل عمل کو جاری رکھنا یقیناً مثبت اثرات کا حامل اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ اس صورت میں اگر حسبِ توقع نتائج سامنے نہ آئیں تب بھی منکرات' انحرافات اور بدعتوں کی شدت تو کم ہو ہی جاتی ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کم از کم اپنے الٰہی فریضے سے تو سبکدوش ہو ہی جاتا ہے۔ انبیاء کرام کی دعوتی زندگی کا مطالعہ بھی روشن کرتا ہے کہ آپ حضرات نے مسلسل اور مختلف طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے اپنی دعوت کو جاری رکھا اور بہترین سے بہترین

اسلوب اختیار کیا۔ قران کریم میں حضرت نوحؑ کے بارے میں ہے کہ۔

"قال رب انی دعوت قومی لیلا و نہارا فلم یزد ھم دعای الا فرارا و انی کلمادعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذا نہم و استغشوا ثیابہم و اصروا و استکبرو اسکتبارا ثم انی دعوتہم جھارا ثم انی اعلنت لھم و اسررت لھم اسرار۔"

"انہوں نے (حضرت نوحؑ نے) کہا پروردگار میں نے اپنی قوم کو دن میں بھی بلایا اور رات میں بھی۔ پھر بھی میری دعوت کا کوئی اثر سوائے اس کے نہ ہوا کہ انہوں نے راہِ فرار اختیار کرلی اور میں نے جب بھی انہیں دعوت دی کہ تو انہیں معاف کردے تو انہوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے اور اپنی بات پر اڑ گئے اور حد سے زیادہ تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں علی الاعلان دعوت دی۔ پھر میں نے اعلان بھی کیا اور خفیہ طور سے بھی دعوت دی۔" (سورۂ نوح ۷۱ آیت ۵ تا ۹)

پیہم اصلاح معاشرہ کی تگ و دو میں لگے رہنے اور بار بار لوگوں تک حق کا پیغام پہنچانے کے ضمن میں ایک حکایت حاضر خدمت ہے۔

وہ ایک ڈاکٹر صاحب نے ایک عالم دین کے پڑوس میں کرائے پر مکان حاصل کرلیا اور اسی کے ایک حصے میں اپنا مطب کھول لیا۔ یہ ڈاکٹر دن بھر مریضوں کے علاج معالجے میں مصروف رہتا اور رات کو اتنی تیز آواز میں موسیقی سنتا کہ پورا محلّہ گونج اٹھتا۔

رات ہی کے وقت میں عالم دین کے گھر میں درس قرآن کا اجتماع ہوا کرتا تھا۔ درس اس شوروہنگامے سے متاثر ہونے لگا۔ لیکن اس سے نمٹنے کا کوئی معقول راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

غرض عالم دین نے ایک شب محلّہ والوں کو جمع کیا اور ان سے کہا۔ لوگو! آج سے ہم اسلام کے ایک زریں اصول پر عمل پیرا ہونے کا عزم کریں اور کل سے ہم میں سے

ہر شخص نہایت ادب و احترام سے ڈاکٹر کے پاس جائے اور اس سے کہے کہ "ڈاکٹر صاحب آپ کے گھر سے ہر رات تیز موسیقی کی جو آواز آتی ہے وہ ہم سب کی تکلیف کا باعث ہے۔"

اگلے دن سے یہ کام شروع ہوگیا اور تقریباً پچاس افراد ڈاکٹر کے پاس یہ شکایت لے کر گئے۔ آخر کار ڈاکٹر اپنے رویئے پر نادم ہوا اور اس نے تیز آواز سے موسیقی سننا چھوڑ دیا۔ یہ اسلوب اتنا کارگر ثابت ہوا کہ ڈاکٹر محلّہ چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔

۱۵۔ آگاہی و شناسائی

دعوت کے فروغ اور اس کے وسیع پھیلاؤ کے لیے مبلغ کا مندرجہ ذیل امور سے واقف و آگاہ ہونا ضروری ہے۔

الف۔ اسلام شناس

یوں تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دین سے متعلق حتی المقدور علم رکھے لیکن داعیانِ دین، مبلغینِ اسلام اور ان افراد پر جو معاشرہ میں اسلامی انقلاب کے قیام کے لیے سرگرمِ عمل ہیں دین کے متعلق وسیع اور کافی معلومات کا حصول ضروری ہے۔

یوں بھی یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جس چیز سے متعلق انسان علم ہی نہ رکھتا ہو اس کی طرف لوگوں کو کیسے دعوت دے سکتا ہے؟ جس چیز کی حسن و خوبی پیشِ نظر نہ ہو اس کی تعریف کیسے کی جاسکتی ہے؟ بالکل اسی طرح جب انسان اسلامی تعلیمات سے واقف نہ ہو، مذہب سے متعلق گہرا مطالعہ نہ رکھتا ہو اور اسلامی فرامین سے آگاہ نہ ہو تو کس طرح وہ ایک ایسا انقلاب لاسکتا ہے جو اسلامی اصول و افکار پر قائم ہو۔ لیکن اس کا یہ مقصد بھی نہیں کہ تمام داعیانِ دین کا اسلام شناسی کے کسی ایک خاص مرتبے پر فائض ہونا ضروری ہے۔ نہیں، بلکہ یہ اسلام شناسی کے مختلف مدارج پر ہوں تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ عام افرادِ معاشرہ سے زیادہ گہری بصیرت اور وسیع آگاہی کے حامل ہوں۔

ب۔ خود شناس

مبلغ اسلام کو سب سے پہلے اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنا چاہیے۔ معرفت نفسانی سے ہماری مراد یہ نہیں کہ اسے طب' نفسیات اور اپنے اعضائے جسمانی کے نظام سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اگرچہ یہ معرفت بھی انسان کے لیے مفید و موثر ہے' بلکہ مقصود یہ ہے کہ انسان قانون و شریعت کے زاویہ نگاہ سے اپنا جائزہ لے۔ اسے واقف ہونا چاہیے کہ اس کا مقصدِ تخلیق کیا ہے۔ خداوندِ عالم نے اسے جو خلافت عطا کی ہے اس کا کیا مقصد ہے۔ بحیثیت خلیفۂ خدا اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ ایک باشعور مسلمان کی حیثیت سے معاشرہ کی تعمیر و اصلاح میں اس کا کیا کردار ہے۔ دورِ حاضر میں اسلامی تعلیمات کی رو سے اس پر کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ.....

ان تمام امور میں غور و فکر کے بعد داعیٔ دین کے قلب و ذہن میں یہ بات راسخ ہونی چاہیے کہ عام افرادِ معاشرہ کی بہ نسبت اس پر پیغام الٰہی کی نشر و اشاعت' تعلیمات ربانی کے فروغ اور نظام اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں کہیں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

"الذین یبلغون رسالات اللہ و یخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ"

"وہ لوگ جو اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور دل میں اس کا خوف رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔" (سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۳۹)

اسی طرح داعیٔ دین کا نظریہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنی ذات' اپنے مقام' اپنے اوقات اور اپنا پورا وجود وقف کرنا ہی مقصدِ تخلیق تک رسائی اور رضاء الٰہی کے حصول کی ضمانت ہے۔ اسی لیے مردانِ حق' خاصانِ خدا اور عاشقانِ راہ الٰہی کے ورد زباں ہوتا ہے۔

"قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ و بذالک امرت و انا اول المسلمین۔"

"کہہ دیجئے کہ میری نماز، میری عبادتیں، میری زندگی، میری موت سب اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا تسلیم کرنے والا ہوں۔" (سورۂ انعام ۶ آیت ۱۶۲ - ۱۶۳)

"انی وجهت وجهی للذی فطر السموٰات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔"

میں تو صدق دل سے اطاعت گزاری کے لئے صرف اس کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (سورہ انعام ۶ آیت ۷۹)

ج۔ زمانہ شناس

مبلغِ دین کے لیے وقت کے تقاضوں اور عصری حالات سے باخبر ہونا انتہائی ضروری ہے۔ چنانچہ طالبِ اصلاح اور داعیٔ دین کے لیے اپنے دور کے فکری رجحانات اور سیاسی نشیب و فراز سے واقف ہونا دعوت کے پھیلاؤ پر کلیدی اثرات مرتب کرتا ہے۔

زمانہ شناس اور حالات کے تقاضوں سے آگاہ داعی کبھی ہوا کے دوش پر نہیں اڑتا بلکہ اپنے اصولی موقف پر قائم رہتے ہوئے بادِ مخالف، انحرافی مظاہر اور گمراہ کن نظریات کے مقابل چٹان کی طرح جما رہتا ہے اور ان سے مقابلہ کے موقع پر کسی قسم کے شک و شبہ اور ابہام کا شکار نہیں ہوتا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"العالم بزمانه لا تهجم علیه اللوابس"

"حالاتِ زمانہ سے آگاہ شخص، زمانے کی مشکلات و مسائل کا شکار نہیں ہوتا۔" (الحیاۃ جلد ۲ ص ۲۹۶)

حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے۔

"اے فرزند! عقلمند کے لیے لازم ہے کہ اپنے کاموں میں غور و فکر

کرے' اپنی زبان پر قدرت رکھے اور اپنے زمانے کے لوگوں کو پہچانے۔" (الحیاۃ ج ا ص ۱۲۸ ۔ امالی شیخ طوسی ص ۱۴۶ ۔ بحار الانوار ج ۷۷ ص ۷۲)

نیز حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

"..... ولا بد للعاقل من ثلاث : ان ینظر فی شانہ و یحفظ لسانہ و یعرف زمانہ"

"عقلمند شخص کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔ اپنے کام میں سوچ بچار کرے' اپنی زبان پر قدرت رکھے' اپنے زمانے کو پہچانے۔" (الحیاۃ ج ا ص ۱۲۸)

آپؑ ہی کا قول ہے۔

"من عرف الایام لم یغفل عن الاستعداد"

"جو گردشِ ایام سے باخبر ہو وہ اس سے مقابلہ کے لیے مستعد رہتا ہے" (الحیاۃ ج ا ص ۱۳۵)

زمانہ شناس مبلغ وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دعوتی پروگرام مرتب کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس وقت سماج کن امراض کا شکار ہے' کن مسائل و مشکلات سے دوچار ہے۔ اس کے بعد وقت کی ضرورت اور اسلوبِ عمل کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد طے کرتا ہے کہ ان مسائل و مشکلات کا حل مذہب کے کون سے پہلو کو اجاگر کرنے میں مضمر ہے اور دعوتی و انقلابی عمل کا آغاز کس نکتے سے کیا جائے۔

اس مسئلہ پر ہم "اسلوبِ عمل اور طریقہ کار" کے ذیل میں گفتگو کرتے ہوئے روشنی ڈال چکے ہیں لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم یہاں قرآن کریم سے ایک نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ قرآن کریم مسائل و مشکلات کے حل کے بارے میں کیا انداز اختیار کرتا ہے۔

قرآن کریم کا مزاج یہ ہے کہ سائل کی جانب سے اٹھائے جانے والے ہر مسئلہ کا

جواب دینے سے احتراز کرتا ہے اور محض انہی مسائل کے بارے میں اپنا نکتہ نظر پیش کرتا ہے جو لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں موثر ہوں۔

سورۂ بقرہ میں ہے کہ۔

"یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج"

"اے پیغمبر یہ لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو فرما دیجئے کہ یہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے وقت معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔" (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۸۹)

اس آیت کے نزول کے موقع پر سائل کا سوال چاند کی کیفیت کے بارے میں تھا اور سائل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ چاند جو مختلف اوقات میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ لیکن نازل ہونے والی آیت نے سائل کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے چاند سے متعلق ان امور کا تذکرہ کیا جو انسانی زندگی میں موثر ہیں اور جن میں اس کے انفرادی و اجتماعی اور دنیاوی و اخروی فوائد مضمر ہیں۔

لہٰذا قرآنِ کریم نے جواب میں فرمایا کہ چاند کے مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کا طلوع ہونا مہینہ کی ابتدا کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی شکل میں ظاہر ہونے والی تدریجاً" تبدیلی عبادات جیسے روزہ اور نماز کی ادائیگی میں مدد ہوتی ہے اور پھر اس کے ذریعے لوگ حج کے ایام کا تعین کرتے ہیں۔

اس انداز کو اختیار کرکے قرآن کریم نے ایک اصول کا تعارف کروایا اور وہ یہ کہ انسان ان باتوں کی جانب توجہ مرکوز رکھے جو اس کے دینوی و اخروی فائدہ سے متعلق ہوں۔ علم برائے علم ایک بے معنی چیز ہے۔ قرآن کریم میں مذکورہ اصول کی جانب اشارہ کرنے والی اور آیات بھی موجود ہیں طالبِ تحقیق اس سلسلے میں بغور قرآن کریم کا مطالعہ فرمائیں۔

د۔ دشمن شناس

دشمن کے عزائم اور معاندانہ منصوبوں سے معمولی سی غفلت اور بے اعتنائی

اسلامی دعوت اور تبلیغِ دین کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا داعی کو دشمن کی شناخت اور اس کے ناپاک عزائم سے باخبر ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ دعوت کی حفاظت بھی کر سکتا ہے اور دشمنان اسلام کو دندان شکن جواب دے کر ان کے شیطانی منصوبوں کو ناکام بھی کر سکتا ہے۔ قرآن کریم متعدد مقامات پر اپنے حقیقی دشمن سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ۔

"ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین انما یامرکم بالسوء والفحشاء وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون۔"

"اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ وہ بس تمہیں بد عملی اور بدکاری کا حکم دیتا ہے اور اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ خدا کے احکام کے خلاف جہالت کی باتیں کرتے رہو۔" (سورۂ بقرہ ۲ آیت ۱۶۸ ـ ۱۶۹)

"الم اعھد الیکم یا بنی ادم ان لا تعبدوا الشیطان انہ لکم عدو مبین۔"

"اے اولادِ آدم کیا میں نے تم کو یہ حکم نہ دیا تھا کہ خبردار شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ یقیناً تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔" (سورۂ یس ۳۶ آیت ۶۰)

"افتتخذونہ و ذریتہ اولیاء من دونی وھم لکم عدو"

"کیا تم مجھے چھوڑ کر اسے (شیطان کو) اور اس کی اولاد کو اپنا سرپرست بنا رہے ہو حالانکہ وہ تمہارا دشمن ہے" (سورۂ کہف ۱۸ آیت ۵۰)

"ان الشیطان لکم عدو فاتخذوہ عدوا انما یدعوا حزبہ لیکو نو امن اصحاب السعیر۔"

"بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو اسے دشمن سمجھو وہ اپنے گروہ کو صرف اس بات کی طرف دعوت دیتا ہے کہ سب دوزخیوں میں شامل

ہوجائیں۔" (سورۂ فاطر ۳۵ آیت ۶)

مذکورہ بالا آیات میں شیطان کو انسان کا دشمن بتایا گیا ہے لیکن بنی نوع انسان کا دشمن صرف شیطان ہی نہیں ہے بلکہ بسا اوقات خود انسان ہی انسان کا بدترین دشمن ثابت ہوتا ہے۔ خاص طور پر باایمان' ہدف دار داعیٔ دین اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے سرگرم فرد کو قدم قدم پر دشمنوں کا سامنا رہتا ہے اور کبھی یہ دشمن دوستوں اور عزیزوں کی صورت میں ظاہر ہو کر انسان کو صراط مستقیم سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم بارہا دشمنِ خدا اور اپنے نظریاتی حریفوں سے بچتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"یایھا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ و قد کفروا بما جاء کم من الحق یخرجون الرسول و ایاکم ان تو منوا باللہ ربکم۔"

"اے ایمان والو خبردار میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بنانا کہ تم ان کی طرف دوستی کی پیش کش کرو جب کہ انہوں نے اس حق کا انکار کردیا ہے جو تمہارے پاس آچکا ہے اور وہ رسول کو اور تم کو صرف اس بات پر نکال رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار (اللہ) پر ایمان رکھتے ہیں۔" (سورۂ ممتحنہ ۶۰ آیت ۱)

"یا یھا الذین امنوا ان من ازواجکم و اولاد کم عدوا لکم فاحذروھم"

"ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں لہٰذا ان سے ہوشیار رہو۔" (سورۂ تغابن ۶۴ آیت ۱۴)

"واعدوا لھم مااستطعتم من قوۃ و من رباط الخیل ترھبون بہ عدواللہ وعدوکم۔"

"اور جو قوت تم بہم پہنچا سکتے ہو اور جتنے گھوڑے تم سرحد پر بندھے رکھ سکتے ہو ان کو ان (کفار) کے مقابلے کے لیے تیار رکھو ایسا کرنے

سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ رکھو گے۔" (سورۂ انفال ۸ آیت ۶۰)

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کو پہچاننے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"الا و ان اعقل الناس' عبد عرف ربہ فاطاعہ' و عرف عدوہ فعصاہ"

"آگاہ ہو کہ لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کو پہچانے اور اس کی اطاعت کرے۔ اپنے دشمن کو پہچانے اور اس کی مخالفت کرے۔" (الحیاۃ ج ۱ ص ۱۳۲۔ بحارالانوار ج ۷۷ ص ۱۷۹)

حضرت امیر المومنینؑ مالکِ اشتر کے عہد نامے میں دشمن سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ولکن الحنر کل الحنر من عدوک بعد صلحہ فان العدو ربما قارب لیتغفل۔"

"صلح کے بعد دشمن سے چوکنّا اور خوب ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دشمن قرب حاصل کرتا ہے تاکہ تمہاری غفلت سے فائدہ اٹھائے۔" (نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۵۳)

آخر میں ہم اس نکتہ کا ذکر کر دینا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کہ مبلغِ اسلام اور دائیٔ دین کا دشمن عام مسلمانوں کے دشمن سے کہیں زیادہ سرسخت' خطرناک' مکار' ہوشیار اور فریبی ہوتا ہے۔ یہ دشمن داعی کو اپنے مقصد اور عقیدے سے دور کرنے کی غرض سے نئے نئے حربے اور طرح طرح کے ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

بنی آدم کا قدیم اور ابدی دشمن شیطان تو ہمیشہ اپنی بھرپور قوت داعیانِ دین کو گمراہ کرنے پر صرف کرتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ عزیز و اقربا' اہل و عیال اور دوست احباب ناصح و خیر خواہ بن کر اسے اپنے مذہبی فریضے اور دعوتِ دین کے سلسلہ میں اس

کی عظیم و گراں بہا ذمہ داری کی ادائیگی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا داعی کے لیے ضروری ہے کہ ہر نصیحت اور خیر خواہانہ مشورے کا اسلامی اصولوں اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں گہرائی کے ساتھ جائزہ لے اور اس کو قبول یا رد کر دینے کے متعلق شرعی حکم معلوم کرے۔ کیونکہ ممکن ہے کوئی نصیحت یا مشورہ ملمع کاری کے بعد پیش کیا گیا ہو جو ظاہر میں تو کچھ ہو اور باطن میں کچھ اور۔ ایسی صورت میں مبلغ کو اچھی طرح چھان پھٹک کر دیکھ لینا چاہیے کہ جو چیز شہد سے زیادہ شیریں نظر آرہی ہے وہ کہیں سُمِ قاتل تو نہیں۔

مذکورہ بالا سطور میں ہم نے مبلغ کی چند صفات پیش کیں۔ امید ہے اصلاحِ معاشرہ کے لیے سرگرمِ عمل افراد اور اداروں کے لیے سود مند ثابت ہوں گی۔ لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ داعیٔ دین کو ہر ممکنہ عیب اور نقص سے حتی المقدور پاک ہونا چاہیے کیونکہ شفاف کردار کا مالک فرد ہی بے داغ معاشرہ کی تعمیر کر سکتا ہے' آلودگیوں سے منزّہ انسان ہی موثر انداز میں بے عیب افراد اور معاشرہ کی تعلیم و تربیت کا اہل ہے۔ اسی لیے خداوند عالم نے انبیاء و مرسلین اور ان کے خاص نمائندوں کو ہر عیب و نقص اور گناہ و معصیت سے پاک اور معصوم بنا کر مبعوث فرمایا۔

"وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین"

"اور ان کو کچھ اور حکم نہیں دیا گیا تھا علاوہ اس کے کہ اللہ کی عبادت کریں' خالص بندگی اسی کی اختیار کریں۔" (سورۂ بیّنہ ۹۸ آیت ۵)

□...○...☆...○...□

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No 11,
M.I. Heights
Mirza Kaleej
Baig Road,
Soldier Bazar
Karachi.
MASOOMEEN WELFARE TRUST (R)

Najafi Cassette Library
Books Sec.
Bait-ul-Sajjad
Soldier Bazar,
Karachi, Ph: 722574

NAJAFI BOOK LIBRARY
Managed by Masoomeen Waqf (R)
Shop No 11,
Mirza Kaleej Baig Road,
Soldier Bazar, Karachi-74400, Pakistan

غیبتِ امامِ زمانہؑ میں

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد ولایتِ فقیہ پر

آیۃ اللہ حسن طاہری خرم آبادی کی گرانمایہ تصنیف

عوامی حکومت
— یا —
ولایتِ فقیہ

کتابِ ہٰذا میں

مسئلہ ولایتِ فقیہ پر آیات و روایات اور عقلِ سلیم

کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے

نیز اس اہم اعتراض کہ "فقیہ کی حکومت جمہوریت سے متصادم ہے"

کا بھی تسلی بخش جواب دیا گیا ہے

بہترین کتابت	عمدہ کاغذ	دیدہ زیب سرورق	۱۶۰ صفحات	قیمت ۲۵ روپے

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - جے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــــ نمبر ۲ ـــــ کراچی